قیمت : -/10 روپئے

ستمبر 2009

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

63 واں یوم آزادی مبارک

نئی شان سے آج نکلا ہے سورج

ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

آبشار اور آتش فشاں

مصنف: فضیل جعفری

فضیل جعفری ہمارے عہد کے معتبر ناقد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ''آبشار اور آتش فشاں'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں 11 مضامین شامل ہیں۔ ان کی یہ تنقیدی تحریریں ادب پاروں پر نہیں بلکہ اپنے عہد کی تنقیدوں اور نقادوں پر ہیں۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر بہت بحثیں ہوئی ہیں اور تائید و تردید میں مزید تشخص اور دلائل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بحث کی تفہیم میں فضیل جعفری کی یہ کتاب قاری کے ذہن کو نئی روشنی عطا کرتی ہے۔

صفحات: 368، قیمت: -/160 روپے

اقبال کی کہانی (پانچواں ...)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظر نامے میں اہم مقام حاصل ہے شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت ہی خوبصورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/13 روپے

دکنی لغت

مرتب: سیّدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ لسانیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ و تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات: 521، قیمت: -/590 روپے

آزادی کی نظمیں

مرتب: سبط حسن

آزادی کی جدوجہد سے متعلق اردو ادب کی اشاعت قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کے تحت جاری ہے۔ ''آزادی کی نظمیں'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں مرحوم رفیع احمد قدوائی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی تھی لیکن حکومت نے اسے ضبط کر لیا تھا۔ یہ مجموعہ محض نظموں کا مجموعہ نہیں بلکہ جدوجہد آزادی کی تاریخ بھی ہے۔ کتاب میں غالب، آزاد اور حالی سے لے کر اکبر الہ آبادی، رضا نقوی واہی اور علی سردار جعفری تک 38 شعرا کی نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت اور بازار میں عدم دستیابی کے پیش نظر کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 143، قیمت: -/80 روپے

...یات راجندر سنگھ بیدی

مرتب: وارث علوی

راجندر سنگھ بیدی اردو فکشن کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کی تحریروں نے قارئین کے بڑے حلقے کو متاثر کیا ہے۔ ''کلیات راجندر سنگھ بیدی'' کی اس دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے ''بے جان چیزیں'' اور ''سات کھیل'' جن میں 11 ڈرامے ہیں، ان کے 29 مضامین جن میں انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات اور تقریظیں ہیں اس کے علاوہ مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں جو اس کلیات میں شامل ہیں۔ بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون عمدہ ہے جو ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

صفحات: 655، قیمت: -/380 روپے

...ات سعادت حسن منٹو (...)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت: -/285 روپے

...دی کے بعد اردو نظم (ایک)

مرتبین — شمیم حنفی، مظہر مہدی

''آزادی کے بعد اردو نظم'' آزادی کے بعد کی اردو نظموں کا ایک جامع انتخاب ہے جس میں 67 نمائندہ نظم نگاروں کی 245 نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظمیں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں پیش کی گئی ہیں اور فٹ نوٹ میں مشکل الفاظ و تراکیب کے معنی بھی دے دیے گئے ہیں جن سے ہندی اردو کے قارئین ایک ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

صفحات: 758، قیمت: -/384 روپے

...لانا آزاد کی سائنسی ...

مصنف: وہاب قیصر

''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ
جلد-11، شمارہ-9، ستمبر 2009

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت اعلی تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066
فون:26103381, 26103938
فیکس:26179657, 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
فون:26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 5

زبان اور تعلیم
● فاصلاتی نظام تعلیم: اہمیت و افادیت .... محمد احسن 6
● اردو اور اردو والوں کی ذمے داریاں .... خالد محمود 9
● عام بجٹ اور تعلیم .... شفیع ایوب 11
● اردو میں پی ایچ ڈی تحقیق کے مسائل .... احسان حسن 13
● ایک اردو دوست کا توجہ طلب خط .... کرتار سنگھ 15

ادب، صحافت، سیاست
● ٹیپو سلطان اور مولانا آزاد .... عبدالغفار شکیل 16
● منگل سوتر— ادھورے ناول کا پورا قصہ .... پردیپ جین 19
● ایوان غزل کا ستون— فراق گورکھپوری .... مہتاب عالم 23
● فضا ابن فیضی .... محمد اختر 25
● تانیثیت کی بنیاد گزار— محمدی بیگم .... نشاں زیدی 28
● 1857 کے مجاہدین آزادی .... اقبال حسین 31
● زلیخا بیگم کی قبر .... فیروز بخت احمد 35
● ہندوستان کا مستقبل اوباما کی نئی سیاست .... آئینہ نظر 37

سفرنامہ
● ٹورانٹو میں تین دن .... مجتبیٰ حسین 39

کلاسیکی ادب
● انتخاب کلام .... میر جعفر زٹلی 42
● سیر پہلے درویش کی .... میر امّن دہلوی 43

ہماری مطبوعات سے
● قومی یکجہتی اور ہندوستانی زبانیں .... مسعود حسین خاں 51
● اقتصادی زندگی میں عورتوں کے لیے مواقع .... صغرا مہدی 57

اردو خبرنامہ .... ادارہ 60
تبصرہ و تعارف 71
● یک بابی اردو ڈرامے .... نوشاد عالم ....
● صحت الفاظ .... سعید النسا ....
● دکنی لغت .... عبدالرشید اعظمی ....
● فکشن شعریات: تشکیل و تنقید .... مشتاق صدف ....
● زر نقد .... نشاں زیدی ....
● ننگی آوازوں کی گونج .... فخر الدین عارفی ....
● دیگر کتب .... ادارہ ....

بچوں کا گوشہ
● دو نظمیں .... فراغ روہوی 77
● چھوٹی سی بھول .... نذیر احمد یوسفی 78

آپ کی بات

■ **منیر احمد عادل، ایڈیٹر روزنامہ سالار، بنگلور**

ڈائرکٹر کے عہدے پر باعزت بحالی کے لیے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

■ **اخلاق اثر، صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال**

اردو کونسل میں دوبارہ آمد پر کیسے کیسے اچھے لوگوں نے آپ کی کارکردگی کو سراہا ہے۔ ''اردو دنیا'' میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ آپ نے اس کی شروعات کی تھی تو اس کو آپ کے دستخط کی حیثیت حاصل ہے۔

قمر رئیس، حبیب تنویر اور کملا ثریا پر مضامین اچھے ہیں۔ کملا ثریا کے تذکرہ نگاروں نے ان کی ملیالی، انگریزی شاعری، کم عمری میں شادی اور اپنے پسند کے خدا کی عبادت کا تو ذکر کیا ہے مگر ان کی حب الوطنی کو نظر انداز کردیا جو ان کے مضمون "Own Your Country" مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا مورخہ 12 اگست 2007 کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ اس اخبار نے کملا ثریا کی اپنے وطن سے نہ ختم ہونے والی محبت کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

■ **قاسم بن ظہیر، 1658، آواس وکاس کالونی، بلند شہر روڈ، ہاپوڑ**

اولاً قومی اردو کونسل کے اعلیٰ عہدے پر دوبارہ فائز ہونے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ دوسرے، جون 2009 کے شمارے میں ''آپ کی بات'' کے تحت ڈاکٹر انور ادیب نے مارکنڈے کاٹجو کے مضمون پر جو سوالات اٹھائے ہیں وہ حق بجانب ہیں۔ غازی علیم الدین نے اپنے مضمون ''اردو میں مستعمل عربی الفاظ'' میں بڑی جستجو اور عرق ریزی دکھائی ہے، محترم نے مضمون میں عربی طرز کتابت پر بھی مختصر روشنی ڈالی ہے جو طلبہ کے لیے کارآمد ہے۔ عطا عابدی کا مضمون ''اردو زبان کا دوسری زبانوں سے رشتہ'' اردو زبان کے دیگر زبانوں سے رشتے کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ ''یادرفتگاں'' کے تحت شمیم احمد شمیم کی 29ویں برسی پر آل احمد سرور مرحوم کا مضمون ''ایک چراغ تھا نہ رہا'' ان کی شخصیت کے ہر پہلو کا بڑی خوش اسلوبی سے احاطہ کرتا ہے۔ پردیپ جین نے پورے سو برس بعد پریم چند کا مضمون ''اتفاق طاقت ہے'' کھوج کر پریم چند کی ادبیات میں جو اضافہ کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ ''ہندوستان کی اردو صحافت کچھ توجہ طلب امور'' یوسف کمال نے اس مضمون کے آخر میں اردو کے فروغ کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ قابل غور اور لائق عمل ہیں۔

ان کے علاوہ بھی تمام مشتملات معیاری ہیں۔

■ **شہاب اختر، کلکتہ کلاتھ اسٹورس، کپڑا پٹی، جھریا-828111 (دھنباد)**

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ صاحب کو دوبارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں ڈائرکٹر کے عہدے پر تقرری کے لیے دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ المنار اسلامک اسٹڈی سینٹر کے اراکین بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ آپ کی سرپرستی میں NCPUL اور بھی فعال ہوگی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ سے سرفراز کرکے اردو کو وقار بخشا ہے۔ گوپی چند نارنگ اردو دوستی کی زندہ مثال ہیں۔

■ **شاہ عمران حسن، منیجر بک کارنر (پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس)**
پوسٹ باکس نمبر-9729 جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

ایک لمبے عرصے کے بعد ماہنامہ ''اردو دنیا'' پر نظر پڑی۔ وطن مونگیر (بہار) سے ہجرت اور مستقل نئی دہلی میں سکونت کی جدوجہد میں راقم الحروف اتنا مصروف رہا کہ ''اردو دنیا'' سے رابطہ نہ رہ سکا۔ ادھر کچھ سکون ملا تو مطالعے کی تشنگی کا احساس ہوا۔ اور میں آپ کے موقر جریدے کو پڑھنے کے لیے مجبور ہوگیا۔

جون 2009 کے شمارے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی واپسی کی خبر سے خوشی ہوئی۔ پریم چند کا نایاب مضمون ''اتفاق طاقت ہے'' پیش کرکے پردیپ جین نے اردو والوں کو اپنا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجبور کردیا ہے۔ غازی علم الدین کا ''اردو میں مستعمل عربی الفاظ'' اور عطا عابدی کا ''اردو زبان کا دوسری زبانوں سے رشتہ'' کافی معلوماتی ہیں۔ ممتاز عالم رضوی کے ذریعے لیا گیا شوکت حیات سے انٹرویو شوکت صاحب کی زندگی کی انوکھی باتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

■ **عمران راہینی، 521، محلہ شیخ سرائے، سٹی اسٹیشن روڈ، پرانا سیتاپور، ضلع سیتاپور-261001 (یوپی)**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' جولائی 2009 نظر نواز ہوا۔ شمارے کے تمام مضامین نہایت معلوماتی اور معیاری ہیں۔ خاص طور پر اداریہ ''ہماری بات'' عبدالعلیم قدوائی صاحب کا مضمون ''ہندوستان میں ابتدائی تعلیم یا پرائمری تعلیم'' دردانہ قاسمی صاحبہ کا ''قرۃ العین حیدر کے ادبی اور شخصی رویے'' معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کو دوبارہ کونسل کی ذمے داری سونپی گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی زیرنگرانی ادارہ اور اردو دونوں ترقی کریں گے۔

عکس جس میں تیرا ٹھہر جائے
آئینہ ہو کہ دل سنور جائے

■ ڈاکٹر محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو گری راج کالج، نظام آباد، آندھرا پردیش-503002

اردو دنیا کا جولائی 2009 کا شمارہ موصول ہوا۔ بدلتی دنیا کی بدلتی قدریں اس میں شامل ہورہی ہیں۔ ایک رسالے کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ سرورق پر عزت مآب کپل سبل کے تعلیمی نظام سے متعلق اصلاحی افکار پیش کیے گئے ہیں ان کے عزائم کو سلام کرتا ہوں کہ انھوں نے عہدہ سنبھالتے ہی تعلیمی انقلاب لانے کے لیے اپنے ارادے ظاہر کیے۔ زبان اور تعلیم کے تحت فکر انگیز مضامین شائع ہوئے ہیں محمد مشاہد نے گلوبلائزیشن اور اردو میں اچھی تجاویز پیش کی ہیں۔ ادب کے تحت دردانہ قاسمی نے قرۃ العین حیدر کے ادبی اور شخصی رویے لکھ کر اچھا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کے تجزیے پیش کریں تو سونے پہ سہاگہ ہوگا۔ ماحولیات کے تعلق سے جو مضمون شائع ہوا ہے وہ بھی دعوت فکر دیتا ہے انسان خود آلودگی پیدا کرکے اپنی موت کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ سماجی ضرورتوں اور بڑھتی آبادی کی وجہ سے ماحولیاتی مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ اردو خبرنامہ سے عالمی سطح پر اردو کی ادبی سرگرمیوں کا علم ہوجاتا ہے۔ ''اردو دنیا'' 21ویں صدی کا ایسا رسالہ ہے جس میں اردو قاری کو وہ سب کچھ ملتا ہے جو کہ وہ چاہتا ہے۔ مدیر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کو مبارک دیتا ہوں کہ وہ دوبارہ اس سے وابستہ ہوگئے ہیں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کی سربراہی میں ''اردو دنیا'' دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے گا۔

■ شاہ عمران حسن، معرفت بک کارنر (پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس) پوسٹ باکس نمبر-9729، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

اردو دنیا بابت جولائی 2009 ہمیں دیر سے ملا۔ اگر رسالہ وقت پر مل جاتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔ بہرکیف دیر آید درست کے مصداق اس ماہ کے رسالے نے بھی ہمیں اپنی طرف کھینچا۔ حیات افتخار کا تجزیاتی مضمون ''علامہ اقبال اور سبراہنیم بھارتی'' کافی معلوماتی ہے اور قاری کو دعوت فکر دیتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقت کو میش بھٹ نے اپنی ماں شیریں کے نام پر شیریں انداز میں ''اردو اور میں'' کے تحت قارئین کے روبرو رکھا ہے۔ ایک کے بعد ایک شخصیت دنیا سے کوچ کرتی جارہی ہے اور اردو زبان میں نئی کھیپ نظر نہیں آرہی ہے۔ اس طرف بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ حبیب تنویر، قمر رئیس، کملا ثریا، محمود علی علیگ اور رئیس احمد جعفری، رضا رامپوری کی وفیات سے دل کو گہرا رنج پہنچا۔ سید امتیاز الدین کے مضمون ''کملا ثریا'' سے ہمیں کملا جی کی زندگی کی بعض جھلکیوں سے روشناس ہونے کا موقع ملا مجھے کملا جی کی بغاوت درست لگی خاص کر ان کی نظم ''اندرا گاندھی کے بعد'' بڑی ہی متاثر کن ہے۔ اقبال حسین کا مضمون ''شہزادہ فیروز شاہ'' نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کی معلومات میں بھی اضافے کا ذریعہ ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ظفر انصاری ظفر کا شعری مجموعہ ''موج موج دریا'' کی اشاعت ہوگئی۔ ظفر انصاری ظفر نوجوان تخلیق کار ہیں اور اپنی باتوں کو سادے انداز میں کہنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ آخر میں بس یہی خواہش رکھتا ہوں کہ آپ کی ادارت میں یہ رسالہ اسی طرح انوکھے پن کے ساتھ اردو والوں کے روبرو آکر انھیں فیضیاب کرتا رہے (آمین)۔

■ محبوب حسن، ماہی ہاسٹل، 33 جے این یو، نئی دہلی-67

رسالہ ''اردو دنیا'' اگست کا تازہ شمارہ نظرنواز ہوا۔ رسالے کے مضامین کو پڑھ کر ذہن پر ایک تاثر قائم ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے علم میں ایک خوشگوار اضافہ ہوا۔ خاص بات یہ کہ اس ماہ سے آپ نے کلاسیکی ادب کی جو شمولیت فرمائی ہے وہ یقیناً مسورکن اور معلومات افزا ہے اس کے لیے ہم نے پہلے بھی آپ سے خواہش ظاہر کی تھی۔ ابرار رحمانی صاحب نے اپنے مضمون بہ عنوان ''تحریک آزادی اور پریم چند'' کے ذریعے عہد ساز ادیب پریم چند کے سماجی و ادبی سروکار کے ساتھ ساتھ ان کے قومی شعور اور جذبۂ حب الوطنی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی غیر افسانوی تحریروں کی روشنی میں۔ مضمون نہایت تحقیقی واہم ہے۔ شکیل اختر صاحب کا مضمون ''اردو اخبارات کے لسانی و تہذیبی سروکار'' ہمیں مختلف سطحوں پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ سرورالہدیٰ صاحب، نثار احمد فاروقی جیسی ادبی شخصیت کو متعارف کرانے میں کامیاب رہے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے خواجہ میر درد کی غزلیہ شاعری کی روایتی تفہیم و تفسیر کے برخلاف ایک نئے نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے جو کہ ایک اہم اضافہ ہے۔ محترمہ چمن آرا خان نے زبان کی تدریس کے طریقۂ کار کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ محمد اعجاز صاحب نے اپنے مضمون کے ذریعے ہم طلبہ و طالبات کو ایک نئی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے جو کہ وقت کی بے حد ضرورت ہے۔ شمیم احمد صدیقی صاحب نے سوائن فلو کے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ شہپر رسول صاحب نے زبیر رضوی سے جو گفتگو کی ہے وہ نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان موجود خلا کو پر کرتی ہے رسالے کے آخر میں محمد عبداللطیف و عبدالرشید اعظمی صاحب کے معلوماتی مضامین ہیں۔ خاص کر عبدالرشید اعظمی صاحب نے ''میں اردو ہوں'' میں جو اچھوتا انداز اختیار کیا ہے وہ بے حد پرلطف ہے۔ ان کے اس مضمون سے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت و اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ رسالے میں شائع شدہ تبصرے اور خبریں بھی کم اہمیت نہیں رکھتے ان پر بھی ہماری نظر رہتی ہے۔

■ ندیم احمد، C-36/5 لین نمبر-2، آر کے مارگ، چوہان بانگر، دہلی-53

''اردو دنیا'' کا شمارہ بابت اگست 2009 باصرہ نواز ہوا۔ اردو کتابوں کی موبائل وین کے بارے میں جان کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ اب اردو کتابیں ہندوستان کے کونے کونے میں حاصل کی جاسکیں گی۔ یہ اردو کی ترویج و ترقی

کے لیے بیحد مناسب و مثبت قدم ہے جسے ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ جیسے ماہر انتظامیہ ہی اپنی فکر و آگہی اور دوراندیشی سے انجام دے سکتے تھے۔ ان کا یہ قدم اردو کتابوں کی فلاح و بقا کے لیے نہایت سودمند، اہم اور حددرجہ ضروری تھا جسے محبان اردو کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

عبدالغنی شیخ کا مضمون ''ہمارا نظام تعلیم'' ایک تجزیاتی اور معلوماتی مضمون ہے جس میں ہندوستان کے تعلیمی معیار سے روشناس کرایا گیا ہے اور چند عمدہ مثالوں کے ذریعے اس نظام میں تبدیلی لانے پر زور دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر چمن آرا اور مرتضیٰ علی اطہر کے مضامین بھی کافی اہم ہیں۔ ابوالکلام قاسمی نے ''منیب الرحمٰن اور میر و فراق کی نظمیں'' کے تحت منیب الرحمٰن جیسے اہم شاعر کی شاعرانہ عظمت، انفرادیت اور خوبیوں پر ناقدانہ گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک منیب الرحمٰن کی شاعری کا توانا پہلو ان کی تحت البیانی، علامتی پیکرتراشی اور منفرد امیجری میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے منیب الرحمٰن کی نظموں کے ایک خاص وصف آوازوں کے زیر و بم سے بھی قاری کو آشنا کیا ہے۔ ابرار رحمانی اور سرورالہدیٰ کے مضامین بھی کافی دلچسپ اور معنی خیز ہیں جن میں اردو ادب کی دو اہم شخصیتوں پریم چند اور نثار احمد فاروقی کی زندگی اور شخصیت کے بعض ایسے گوشوں کو عیاں کرنے کی سعی کی گئی ہے جن کی مدد سے ان شخصیات پر مختلف تناظرات کی روشنی میں اور بھی بہت کچھ تلاش کیا جاسکتا ہے۔ شکیل اختر کا مضمون قدیم اردو اخبارات میں پنہاں لسانی اور اسلوبیاتی خوبیوں سے باخبر کرتا ہے جن کی اہمیت اور قدر و قیمت تب سے لے کر آج بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ ''سوائن فلو'' اور ''ای بکس'' موجودہ دور کی ضرورت کے لحاظ سے لکھے گئے معلوماتی نوعیت کے مضمون ہیں۔ زبیر رضوی کی شہپر رسول سے گفتگو کافی سنجیدہ ہے جو ایک ادیب و شاعر کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے جس میں ادب سے ان کی والہانہ محبت کی شہادتیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ الغرض پورا جریدہ فکر و بصیرت سے پُر ہے اور یہی خوبی ''اردو دنیا'' کو دیگر جرائد سے منفرد و ممتاز بناتی ہے اور اسے سربلندی عطا کرتی ہے۔ یقیناً ''اردو دنیا'' تمام اردو جرائد میں سب سے افضل ہے جو اپنے قارئین کو ادبی حظ پہنچانے کے ساتھ انھیں عصری منظرنامے سے باخبر کرتا ہے اور بصیرت و آگہی کے ساتھ زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔

■ **شمیمہ انصاری، J22/75، لدھن پورہ، جیتپورہ، وارانسی-221001**

میں اردو ادب کی طالبہ ہوں۔ رسالہ ''اردو دنیا'' جاری کرواتے ہی اُگست کا تازہ شمارہ موصول ہوا، دلی شکریہ!۔ زبان و ادب کے حوالے سے جو بحثیں کی گئی ہیں وہ نہایت معنی خیز و کارآمد ہیں خاص طور پر محترمہ چمن آرا خان کا مضمون قابل تعریف ہے۔ ابرار رحمانی صاحب نے بھی نہایت اہم مضمون قلمبند کیا ہے۔ ان کا یہ مضمون پریم چند کے سماجی سروکار اور قومی یکجہتی کے جذبے کو اجاگر کرتا ہے کلاسیکی ادب کے تناظر میں جو اضافہ ہوا ہے وہ رسالے کی معنویت میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کو پرلطف و پرکشش بناتا ہے۔ رسالے کے آخر میں ''میں اردو ہوں'' کا اچھوتا انداز دل کو بھا گیا۔ عبدالرشید صاحب سے گزارش ہے کہ آگے بھی اس قسم کے مضامین ارسال کریں محمد عبداللطیف نے گیان پیٹھ انعام میں اردو ادیبوں کی حصے داری کو پیش کر کے ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

■ **عطاءاللہ، ہاؤس نمبر 16-4-119/1، چنچل گوڑہ، حیدرآباد-500024**

اگست کا شمارہ وصول ہوا۔ رسالہ خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے کلاسیکی ادب میں آپ نے ولی اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی کی غزلیں شائع کیں۔ راقم نے سراج اورنگ آبادی کے جانشین ضیاء الدین پروانہ کا دیوان مدون کیا ہے اس کی ایک کاپی پیش خدمت ہے۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ حیدرآباد میں ہے۔

■ **ڈاکٹر مشتاق احمد، پرنسپل ملت کالج، دربھنگہ**

آپ کے ماہنامہ ''اردو دنیا'' بابت مارچ 2008 میں میرا ایک مضمون بعنوان ''اردو۔ عالمی لسانی تناظر میں'' صفحہ 11-12 پر شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون میرے ایک طویل مقالے کی تلخیص ہے۔ بعد میں میرا یہ مقالہ کئی جگہ شائع ہوا تھا۔ حیرت ہے کہ میرا شائع شدہ مضمون ''اردو دنیا'' بابت جولائی 2009 میں معمولی رد و بدل کے ساتھ بعنوان ''گلوبلائزیشن اور اردو'' محمد مشاہد شعبۂ ایجوکیشن مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے نام سے صفحہ 13-14 پر شائع ہوا ہے۔ مجھے افسوس اور حیرت ہے کہ جناب مشاہد نے یہ نازیبا حرکت کیوں کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ادارے سے سہو ہوا ہے یا جناب مشاہد کی غیر اخلاقی جرأت کا نتیجہ ہے۔ برائے مہربانی اس کی وضاحت فرمائیں گے۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

ہم ڈاکٹر مشتاق احمد سے معذرت خواہ ہیں۔ مضمون چونکہ ہمیں نئے عنوان کے ساتھ بھیجا گیا تھا اور سوا سال سے بھی کچھ زیادہ وقت گزر جانے کے بعد ڈاکٹر مشتاق احمد کے مضمون کا متن ذہن میں محفوظ رہ جانا ممکن نہیں تھا نیز مضمون مولانا ابوالکلام آزاد یونیورسٹی جیسے موقر ادارے سے وابستہ شخص نے ہمیں بھیجا تھا اس لیے ہم نے اسے شائع کردیا۔ ہمیں اپنے اس سہو پر سخت افسوس ہے مگر ہم جناب محمد مشاہد کی اس جرأت پر حیران ہیں کہ انھوں نے ''اردو دنیا'' سے سرقہ کیا ہوا مضمون ''اردو دنیا'' ہی میں دوبارہ اشاعت کے لیے ارسال کردیا۔ ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا گیا ہے:

چہ دلاور ست دزدے کہ بہ کف چراغ دارد

ادارہ

ہماری بات

نظام عدل کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ حصول انصاف میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے ورنہ انصاف کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔ اس اصول کو سبھی تسلیم کرتے ہیں لیکن موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اس اصول کا عملی اطلاق شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس صورتِ حال کی افسوسناکی پر پچھلے دنوں تھانے کے ضلع اوتان میں مہاراشٹر جوڈیشیل اکیڈمی کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا پاٹل نے کہا کہ عدلیہ کو جن مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے ان میں ایک اہم مسئلہ عدالتوں میں طویل عرصے سے زیرِ غور معاملات ہیں۔ زیر سماعت معاملات کے فیصل ہونے میں اتنی تاخیر کیوں ہوتی ہے، اس پر سوچنا اور اس کا حل نکالنا ہوگا۔ محترمہ پرتبھا پاٹل نے یہ بھی کہا کہ انصاف تک پہنچ کافی مہنگی ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ عدالتی فیس ہو یا وکلا کی فیس، اس سے سماج کے غریب طبقے کی انصاف تک پہنچ مشکل ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے پنجاب اور ہریانہ کی مشترکہ راجدھانی چنڈی گڑھ میں ہندوستان کے چیف جسٹس کے. جی. بالاکرشنن بھی عدالتی فیصلوں میں تاخیر پر اپنی تشویش ظاہر کر چکے ہیں، جہاں وہ جوڈیشیل اکادمی کی نئی عمارت کا افتتاح کرنے گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے ملک میں ایک عام آدمی کو حصولِ انصاف کے لیے جن پریشانیوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ مختلف نوعیت کی ہیں، اس کا خاص سبب انھوں نے عدالتوں کی کمی کو قرار دیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت ملک بھر کی عدالتوں میں دیوانی مقدمات سے قطع نظر صرف ان فوجداری مقدمات کی تعداد جو زیر سماعت ہیں، ایک کروڑ چھبیس لاکھ ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں زیر سماعت مقدموں کا شمار سو دو سو کے درمیان ہی رہتا ہے۔

قطع نظر اس سے کہ بیشتر ترقی یافتہ ملکوں کی آبادی ہندوستان کی مجموعی آبادی سے ایک چوتھائی یا اس سے بھی کچھ کم ہے اس لیے وہاں مقدمات کی تعداد بھی کم ہوگی۔ ایک کروڑ چھبیس لاکھ فوجداری مقدمات کا زیر سماعت ہونا، تشویشناک صورت حال کی نشاندہی کرتا ہے۔ عزت مآب چیف جسٹس نے کہا کہ ملک میں دس ہزار نئی عدالتوں کے قیام کی ضرورت ہے بھی عام آدمی جلد اور سستا انصاف پا سکتا ہے۔

نئی عدالتوں کا قیام حکومت کے دائرۂ عمل میں آتا ہے، وہ عدلیہ کے ساتھ صلاح و مشورہ کرکے انصاف کے جلد حصول کو یقینی بنانے کے لیے ضروری اقدامات کر سکتی ہے لیکن حکومت کے کسی فیصلے تک پہنچنے اور پھر اس فیصلے کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک لمبی مدت درکار ہو سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو مقدمات زیر سماعت ہیں، ان کا جلد فیصلہ کیوں کر ہو۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حصول انصاف میں تاخیر کے بڑے ہی خراب اثرات سماج پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے جرائم پیشہ افراد کے حوصلے بڑھتے ہیں اور ان کے دلوں سے قانون کا خوف جاتا رہتا ہے، نیز جن لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور وہ مجرموں کی چیرہ دستیوں کا ہدف بنے ہیں، قانون کی کارکردگی پر ان کا بھروسہ متزلزل ہونے لگتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں بالخصوص ہندوستان جیسے جمہوری اور کثیر الابعاد معاشرے میں یہ تاثر عام ہوجانا کسی طرح مناسب نہیں۔ صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا پاٹل نے مقدمات پر ہونے والے مصارف کی طرف بھی بجا طور پر توجہ مبذول کرائی جن کا بوجھ برداشت کرنا عام آدمی کے لیے مشکل ہوجاتا ہے۔ مقدمات کی طویل عرصے تک سماعت جاری رہنے کے علاوہ مصارف بڑھ جانے کا ایک سبب وکلا کی جلبِ زر کی ہوس بھی ہوتی ہے جس کے زیر اثر وہ سیدھے سادے معاملات کو بھی پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔

جھوٹے مقدموں میں بے گناہوں کو پھنسانے کی روش بھی عام ہوتی جارہی ہے۔ اصلی مجرم کسی نہ کسی طرح سزا سے بچ نکلتا ہے یا طویل عرصے تک بچا رہتا ہے جبکہ بدقسمتی سے ملزم بنائے جانے والے لوگوں کو طرح طرح کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بالآخر چاہے وہ باعزت بری ہوجائیں لیکن دورانِ سماعت جن ذہنی الجھنوں کا شکار رہتے ہیں اور ان کے سماجی وقار کو جو ٹھیس لگتی ہے اس کا ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب شاید کسی کے پاس نہ ہو۔

زیادہ تشویشناک امر یہ ہے کہ جھوٹے مقدمے گھڑنے کے الزامات اب کچھ سرکاری ایجنسیوں پر بھی عائد ہونے لگے ہیں۔ سرکاری ایجنسیوں سے شہری بجا طور پر یہ توقع کرتے ہیں کہ ان کا رویہ منصفانہ ہوگا اور وہ اپنے اختیارات کا استعمال لوگوں کی بھلائی کے لیے کریں گی، انھیں پریشان کرنے کے لیے نہیں۔ اگر سرکاری ایجنسیوں کی یہ ساکھ خراب ہوئی اور ان کی غیر جانبداری پر حرف آیا تو یہ بہت ہی افسوسناک ہوگا، افسوسناک ہی نہیں اس کے نتائج بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں اور سماجی نظم و ضبط کا شیرازہ بکھر سکتا ہے۔

ہندوستان جیسے بڑے جمہوری ملک میں عدلیہ کی جو اہمیت ہے اور جمہوری نظام کے استحکام میں عدلیہ کی جو حصہ داری ہے وہ محتاج بیاں نہیں ہے۔ صدر جمہوریہ اور عدلیہ کے ایک اہم رکن کا یہ احساس کہ ملک میں عدالتوں کی تعداد ضرورت کے مطابق نہیں ہے، ایک ایسی کمی کی طرف اشارہ ہے جسے جلد از جلد دور کرنا ضروری ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ حکومت اس معاملے کو اپنی ترجیحات میں شامل کرکے کوئی مؤثر قدم اٹھائے گی۔ نیز عدالتیں بھی اپنے کام میں تیزی لانے پر دھیان دیں گی۔

□□□

محمد احسن

فاصلاتی نظام تعلیم: اہمیت وافادیت

تعلیم ہمیں نہ صرف روزگار اور ذریعۂ معاش مہیا کراتی ہے بلکہ ہماری شخصیت کو بھی سنوارتی اور نکھارتی ہے۔ یہ ہمارے کردار کے خدوخال طے کرتی ہے اور ہمیں مہذب اور بااخلاق بناتی ہے۔ ہماری فکر میں وسعت پیدا کرتی ہے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ خود اعتمادی کو فروغ دیتی ہے۔ یہ ہمارے اندر استقلال پیدا کرتی ہے اور ضبط نفس کی تلقین کرتی ہے۔

تعلیم جمہوریت کا سنگِ بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کی اہمیت اس دور میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور ہمارے پاس اس میدان میں آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن سچائی یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی آبادی کو صرف رسمی نظام تعلیم (Campus Education System) کے ذریعے تعلیم یافتہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے گذشتہ کئی دہائیوں سے تمام طبقوں تک تعلیم کو پہنچانے کے لیے رسمی تعلیم کے ساتھ فاصلاتی نظام تعلیم کا سہارا لیا جارہا ہے کیوں کہ یہ واحد نظام تعلیم ہے جو آج کے Challanges کو قبول کرتا ہے اور کفایتی بھی ہے۔

فاصلاتی تعلیم کم خرچ میں نہ صرف شرح خواندگی کی توسیع کرتی ہے بلکہ اس میں ایسے مواقع بھی موجود ہیں جو ٹیکنالوجی کی ترقی کے موجودہ دور میں اہمیت رکھتے ہیں۔ آج کل والدین سوچتے ہیں کہ جدید ٹیکنالوجی ایک ایسا راستہ ہے جس پر چل کر ان کے بچے زیادہ کما سکتے ہیں اور بہتر معیارِ زندگی حاصل کرسکتے ہیں۔ ہندوستان میں نیشنل لیٹریسی مشن (NLM) کے نتیجے میں شرح خواندگی میں زبردست اضافہ ہوا ہے اور لوگ چاہتے ہیں کہ ان کو لکھنا پڑھنا بخوبی آجائے اور وہ اپنی تعلیم کی کمی کو پورا کرلیں۔ بہت سے افراد ایسے ہیں جو بنیادی مہارتوں میں بہتری چاہتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے اندر مختلف ہنر پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ کاروباری مارکیٹ میں استحکام حاصل کرنے کے بعد وہ اپنا تعلیمی معیار مزید بلند کریں۔ جب کہ رسمی تعلیم کے دروازے ان کے لیے تقریباً بند ہوتے ہیں۔ روایتی اسکولوں کے نظام تعلیم کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے علاوہ مقابلے کے رجحان کی وجہ سے تعلیمی اداروں کی اجارہ داری لامحدود ہوگئی ہے۔ ایسے ماحول میں تعلیم ایک باقاعدہ جاری رہنے والا عمل نہیں ہوسکتا۔ اس کا متبادل فاصلاتی تعلیم ہی فراہم کرتی ہے۔ البتہ سرجری میں مہارت، خطرناک ادویات اور مشینری وغیرہ کو استعمال کرنے کی اہلیت کو فاصلاتی تعلیم کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں ایسا ہونا مشکل ہے۔ لیکن اب ترقی پذیر ممالک میں بھی Multimedia based Educational Technology کے ذریعے ان دشواریوں کو کم سے کم کیا جارہا ہے۔ البتہ دوسری مہارتوں مثلاً ڈرائنگ، ٹائپنگ، ڈیزائننگ وغیرہ فاصلاتی تعلیم میں سیکھا جاسکتا ہے۔

فاصلاتی تعلیم کے فوائد:

1. فاصلاتی تعلیم، طلبہ کے لیے آسان Entry Level فراہم کرتی ہے۔ طلبہ اس میں آسانی سے داخلہ لے سکتے ہیں اور اپنی رفتار سے تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔
2. فاصلاتی تعلیم میں فاصلہ رکاوٹ نہیں بنتا۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور دوسرے ذرائع ابلاغ کی آمد نے پوری دنیا کو ایک گلوبل گاؤں بنادیا ہے۔
3. اس میں تعلیم کے حصول کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔
4. فاصلاتی تعلیم میں روایتی کمرۂ جماعت نہیں ہوتے جن میں روزانہ طلبہ کا حاضر ہونا ضروری ہو۔
5. اس نظام کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ وہ دن کے وقت اپنا کام جاری رکھیں اور شام کو کسی کورس میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کریں۔
6. فاصلاتی تعلیم میں طالب علم اپنی رفتار کے مطابق جماعت کے دباؤ سے آزاد ہوکر اپنا کام کرسکتا ہے۔ مزید اس میں اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ طے شدہ مدت میں اگر کورس مکمل نہ ہوسکے تو اسی فیس میں طالب علم اس کو مستقبل میں مکمل کرسکتا ہے۔
7. فاصلاتی تعلیم بہت سے تعلیمی پروگراموں کے لیے مناسب ہے۔ مثلاً مختلف پیشہ ورانہ تربیتی کورسز اور دیگر مضامین اس میں بخوبی پڑھائے جاسکتے ہیں۔
8. لچکیلا پن اس کی اہم خصوصیتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کا نصابی کام کسی بھی سطح پر کیا جاسکتا ہے۔
9. یہ طریقۂ تعلیم مختلف طریقوں اور تکنیکوں کے استعمال کے لحاظ سے لچکدار ہے تاکہ انفرادی طلبہ کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔
10. فاصلاتی تعلیم رسمی تعلیم کی بہ نسبت بہت زیادہ آسان ہے اس کے ذریعے ایک وقت میں بہت سے لوگوں کو تعلیم دی جاسکتی ہے اور یہ ایسے حالات

میں زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہے جب افرادی قوت (Manpower) کی کمی ہو جاتی ہے۔

اکتوبر 1998 تک دنیا کے ایک تہائی ممالک میں 1117 تعلیمی ادارے فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت مختلف کورسیز پڑھا رہے تھے، جن کی تفصیل مندرجۂ ذیل ٹیبل میں دی گئی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دو ملین سے زائد افراد اس نظامِ تعلیم سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ صرف دولتِ مشترکہ (Common Wealth Countries) میں تقریباً دو سو تعلیمی ادارے اس نظام کے تحت چل رہے ہیں۔

دنیا کے مختلف علاقوں میں فاصلاتی نظام تعلیم

علاقہ	ممالک	اداروں کی تعداد
افریقہ	31	159
ایشیا	19	109
آسٹریلیا/پیسفک	05	096
یورپ	25	412
مشرق وسطیٰ	03	003
شمالی امریکا	03	278
کیریبین	05	007
لاطینی امریکا	12	053

آج کل عوام میں بڑھتی ہوئی آگاہی کی وجہ سے تمام سطحوں پر تعلیم کا مطالبہ خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں بڑھ رہا ہے اور کوئی شخص عوام کے تعلیم کے قانونی حق سے انکار نہیں کرسکتا۔ اس طرح فاصلاتی تعلیم ہی وہ نظام ہے جو اس چیلینج کا سامنا کرسکتا ہے۔ اس نظام کا بڑا مقصد بڑے پیمانے پر لوگوں کو تعلیم دینا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کو جو دیہاتی علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کو تعلیم کے مواقع نہیں ملتے ہیں یا وہ اپنی تعلیمی قابلیت میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ فاصلاتی نظام تعلیم کی خاص بات تعلیمی اخراجات میں کمی ہے۔ یہ نہ صرف تعلیمی مسائل کا سستا حل ہے، بلکہ بعض صورتوں میں حیرت انگیز طور پر موثر بھی ہے۔ اس کا انتظامی ڈھانچہ روایتی نظام تعلیم سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اس نظام تعلیم کے تحت طالب علم ادارے کے پروگرام پر سختی سے عمل کرنے کا پابند نہیں ہوتا۔ اوپن لرننگ سسٹم (Open Learning System) میں تدریسی مواد بہت معیاری اور سائنٹفک ڈھنگ سے تیار کیا جاتا ہے تاکہ اساتذہ کی کمی کا احساس کم سے کم ہو۔ ان دنوں کچھ یونیورسٹیاں طلبہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے نہ صرف مشاورت (Counselling) کا انتظام کر رہی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ذاتی رابطے کے پروگرام بھی منظم کر رہی ہیں تاکہ فاصلاتی تعلیم کے طلبہ کو طبع شدہ مواد کے ساتھ دوسری اہم چیزیں بھی فراہم کی جاسکیں۔ اس طرح کے رابطے کے پروگراموں کو براہِ راست سیشن (Face to face session) یا ذاتی ملاقات پروگرام (Personal (PCPs) concat programmes بھی کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے پروگرام طلبہ کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اپنے اساتذہ کے ساتھ ذاتی طور پر رابطہ قائم کرسکیں اور اپنے کورس سے متعلق انفرادی مسائل کو حل کرسکیں۔

براہ راست سیشن اور PCPs کے علاوہ اوپن نظام میں ورکشاپ (Workshop) کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ فاصلاتی تعلیم میں ورکشاپ بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ (کچھ یونیورسٹیوں مثلاً اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نے Distance mode B.Ed & M.Ed جیسے کورسز کے لیے ورکشاپ لازمی قرار دیا ہے۔ جو طلبہ ان ورکشاپس میں شریک نہیں ہوتے انھیں ان کورسز میں فیل قرار دیا جاتا ہے) ورکشاپوں کے ذریعے طلبہ کو یہ مواقع فراہم کیے جاتے ہیں کہ امتحانات سے قبل متعلقہ کورس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ورکشاپ کے دوران طلبہ کو جدید ٹیکنالوجی مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، سلائڈ پروجکٹر اور ہیڈ پروجکٹر، فلم اسٹرپ کے ذریعے بھی پڑھایا جاتا ہے۔ ورکشاپس کے دوران طلبہ کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ آپس میں مل کر اہم مشترکہ مسائل حل کریں۔ فاصلاتی تعلیم کی وسعت کی بہت سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر ساری دنیا میں اس کا دائرۂ کار بڑھتا جا رہا ہے۔ ان میں سے چند اہم وجوہات مندرجۂ ذیل ہیں:

1. تکنیکی ترقی:

فاصلاتی تعلیم کی وسعت کی ایک وجہ تکنیکی ترقی ہے بلکہ ذرائع ابلاغ کی ترقی کو فاصلاتی تعلیم کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ابتدائی دور میں اس کی ترقی ڈاک کے ذریعے ممکن ہوئی۔ اُنیسویں صدی میں ڈاک نے جو ترقی کی، اس کی بدولت اساتذہ اور طلبہ کے درمیان خط و کتابت کے ذریعے رابطہ ممکن ہوسکا۔ ابتدائی دور میں یہ عمل صرف مدارس کی کتب تک محدود تھا۔ انسانی تاریخ کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنی تدریسی کتب کے علاوہ دوسری کتب کے ذریعے بھی علم حاصل کرتا رہا ہے لیکن اُنیسویں صدی میں شائع شدہ مواد کو اُستاد اور شاگرد کے درمیان رابطے کے طور پر استعمال کیا گیا اور موجودہ دور میں اشاعتی نظام ہی سب سے جامع سمجھا جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں ذرائع ابلاغ میں ایک انقلاب برپا ہوا اور ریڈیو، ٹیلی ویژن، آڈیو/ویڈیو کیسٹ اور کمپیوٹر تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیے جانے لگے۔ اس طرح فاصلاتی تعلیم کی افادیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ذرائع ابلاغ فاصلاتی تعلیم کے ضروری اجزا ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ تکنیکی ترقی کی بدولت جو سہولیات حاصل ہوئیں ان کو

بروئے کار لاکر فاصلاتی تعلیم آج اس منزل تک پہنچی ہے۔

2. تعلیم کی مانگ میں اضافہ:

اس وقت ساری دنیا میں تعلیم کی زبردست مانگ ہے۔ نتیجتاً زیادہ تر ممالک میں فاصلاتی تعلیم کا نظام رائج کیا گیا ہے تاکہ تعلیم کی مانگ کو پورا کیا جاسکے۔ دنیا کی آبادی خصوصاً ترقی پذیر ممالک کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے جس کے نتیجے میں اسکولوں میں بچوں کی تعداد میں اضافہ ہونا لازمی ہے اور کئی ممالک کو ان وجوہات کے سبب اپنے تعلیمی نظام کے نظم ونسق میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جس کے سبب وہ اپنے تعلیمی مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پارہے ہیں۔ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکا کے ممالک میں آبادی میں کثیر اضافہ ہوا ہے۔

3. روایتی تعلیم کے کثیر اخراجات:

فاصلاتی تعلیم کی وسعت کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ عام روایتی تعلیم میں بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے سہولیات کا فقدان ہے اور اس کے اخراجات بھی زیادہ ہیں۔ ورلڈ بینک کے مطابق بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں تعلیمی اخراجات ملکی بجٹ اور قومی پیداوار سے تجاوز کر رہے تھے۔

4. تعلیم میں نئے تصورات کا دخل:

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم میں ترقی ہوتی چلی گئی اور نئے نئے تصورات اُبھرنے لگے۔ اس میں جمہوریت کا ایک عنصر بھی شامل ہونا شروع ہوگیا۔ اس عنصر نے تعلیم کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کو بڑی تیزی سے وسعت بخشی۔ فاصلاتی تعلیم کی ترقی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ زیادہ لوگوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں ہی لوگوں کو یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ اکیسویں صدی عوامی تعلیم کی صدی ہوگی اور تعلیم کے میدان میں جس قوم کی پہنچ جتنی ہوگی اتنی ہی وہ ترقی کی راہ پر آگے بڑھ سکے گی۔

5. فاصلاتی تعلیم کی اہمیت:

فاصلاتی تعلیم کی ترقی اور وسعت میں سب سے اہم اور بڑا عنصر اس کے فوائد ہیں۔ جو عام تعلیمی نظام میں نہیں ملتے۔ اس وقت ساری دنیا میں فاصلاتی نظام تعلیم کو ایک علاحدہ تعلیمی نظام کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے۔ فاصلاتی تعلیم میں عام تعلیمی طریقوں کی جگہ جدید طریقوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم میں اسکولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک معلم ایک وقت میں ایک سے زیادہ طالب علموں کو سکھا سکتا ہے جو کہ عام طور پر اسکولوں میں ممکن نہیں ہوتا۔

فاصلاتی تعلیم کی ایک اہم خوبی اس کا تدریسی مواد ہے جسے خود تدریسی مواد Self Instructional Material (SIM) کہا جاتا ہے۔ رسمی تعلیم کے برعکس فاصلاتی تعلیم کا نصاب مکمل طور پر منصوبہ بند ہوتا ہے۔ جب کہ رسمی تعلیم کے نصاب کے کچھ حصے ہی منصوبہ بند ہوتے ہیں اور اس کے کچھ حصے غیر منصوبہ بند آموزش (Unplanned Learning) کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔ فاصلاتی نظام تعلیم میں اساتذہ کی کمی کو طبع شدہ مواد (Printed Material) میں Mediated Communication کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔ مزید برآں طبع شدہ مواد میں سبق کے خاتمے پر اپنی صلاحیت کی جانچ کے لیے سوالات اور ان کے جوابات شامل کیے جاتے ہیں تاکہ اساتذہ کی کمی کو بڑی حد تک پورا کیا جاسکے۔

فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ یہ ایک وقت میں مختلف شعبوں میں تعلیم دے سکتا ہے۔ فاصلاتی تعلیم مختلف شعبوں میں مختلف طریقوں سے اور مختلف عمر کے لوگوں کو تعلیم بہم پہنچاتی ہے۔ فاصلاتی تعلیم مختلف شعبوں میں جغرافیائی رکاوٹوں کے باوجود تعلیم کو فروغ اور وسعت دے سکتی ہے۔ فاصلاتی تعلیم کی خودمختاری کو بھی ایک فائدہ گردانا جاسکتا ہے۔ اس نظام کے تحت طالب علم کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنا تعلیمی پروگرام مرتب کرسکے اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض بھی پورے کرسکے۔ اس طرح فاصلاتی نظام تعلیم سیکھنے والوں کو آسانی فراہم کرتا ہے۔ اس کی بدولت وقت اور پیسے کی بچت ہوتی ہے اور طلبہ سفر سے بھی بچ جاتے ہیں۔ □□□

پتہ:
Regional Director,
Bhopal, Regional Centre,MANUU, Bhopal

اردو زبان کی تدریس

مصنف: معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے درس وتدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ یہ کتاب طلبہ واساتذہ کی انھی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات:148، قیمت-/29روپے

خالد محمود

اردو اور اردو والوں کی ذمے داریاں

ہندوستان میں اردو زبان کے مسائل پر عرصۂ دراز سے گفتگو ہو رہی ہے۔ رسائل و اخبارات میں ایسے مضامین اور خطوط چھپتے رہتے ہیں جن میں اردو کے تئیں ہمدردی اور فکرمندی ظاہر کی جاتی ہے۔ کانفرنسوں، سیمیناروں اور ورکشاپوں کے شہر دہلی کے علاوہ دوسرے علاقوں کی ایسی خبریں اور رپورٹیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے اردو والوں کی تشویش کا اظہار ہوتا ہے۔ الیکشن کے زمانے میں سیاسی دکانوں کے اشتہارات بھی دیواروں پر اور اخباروں میں نظر آنے لگتے ہیں۔ بہتوں کی سیاسی تجارت یا تجارتی سیاست چمک اٹھتی ہے۔ ووٹوں کی سیاست یوں ہی کی جاتی ہے اس لیے یہ اعمال ایسے قابل اعتراض بھی نہیں اور ایسا بھی نہیں کہ اردو کی حمایت میں بلند ہونے والی ساری آوازیں سیاسی یا تجارتی ہی ہوں، ان آوازوں میں اردو کے مخلصوں اور بہی خواہوں کی آوازیں بھی شامل ہوتی ہیں مگر یہ موثر بھی ہوئیں۔ ان کا اثر وہ لوگ بھی قبول نہیں کرتے جن کی مادری زبان اردو ہے اور وہ لوگ بھی نہیں جنھوں نے اردو کے ذریعے عزت، شہرت اور دولت حاصل کی ہے اور وہ بھی نہیں جنھیں اردو نے ایک پہچان اور ایک تہذیب سے نوازا ہے اور وہ بھی نہیں جنھیں اردو نے اسلاف کے قابل فخر کارناموں سے روشناس کرایا ہے اور مذہبی تعلیمات سے سرفراز کیا ہے، مستثنیات کی بات اور ہے۔ راقم کے نزدیک اردو کا مخلص اور بہی خواہ صرف وہی شخص ہے جو اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کی فکر کرتا ہے یہ کام کسی اسکول کے وسیلے سے کیا جا رہا ہے یا نجی طور پر اس سے کوئی بحث نہیں۔ عملی اقدام شرط ہے۔

کسی بھی ملک میں اس ملک کی اردو جیسی زندہ زبان کو جس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بے شمار ہو اور جس کا ادب، عالمی ادب سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس کی شیرینی اور لطافت کے بھی معترف ہوں، زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے پڑھنے والوں کی بہرصورت حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اور اس زبان کے فارغ التحصیل طلبہ کو روزگار کے مواقع بھی حاصل ہونے چاہئیں۔ افسوس کہ اردو کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا، آزادی کے بعد ہی سے اس زبان کی حق تلفی ہوتی رہی اور آج بھی تھوڑی بہت اشک شوئی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے۔ اردو کی حق تلفی کا ایک سنگین پہلو یہ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے جو علاقے اردو کے تھے، تقسیم کے بعد ان علاقوں کی زمین اردو پر تنگ کردی گئی۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ اردو کے سلسلے میں بھی یہ غلط رائے قائم کرلی گئی کہ یہ زبان تقسیم وطن کی ذمے دار ہے۔ یہ پروپیگنڈہ کچھ ایسے شاطرانہ انداز سے کیا گیا کہ اردو اور مسلمان برسوں اپنی صفائی پیش کرتے رہے اور اپنی بے گناہی کا ثبوت دیتے رہے۔ حملہ کچھ ایسا نفسیاتی اور منظم تھا کہ اردو والے اولاً تو حواس باختہ ہوگئے تھے پھر آہستہ آہستہ جب یہ دھند چھٹی اور غبار بیٹھا تو خاصی دیر ہوگئی تھی اور اردو ناقابل تلافی نقصان برداشت کرچکی تھی۔ اس تاریکی میں ایک روشن پہلو ضرور تھا کہ یہ پورے ملک کی صورت حال نہیں تھی۔ ہندوستان کے غیر ہندی علاقوں میں (جہاں علاقائی زبانوں کا راج پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے) اردو کے ساتھ کوئی تعصب یا تصادم کبھی تھا نہ اب ہے۔ یہ تعصب انھیں ریاستوں میں پنپا ہے جو ہندی ریاستیں کہی جانے لگی ہیں۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، نسلی اور لسانی اعتبار سے ہندی اور اردو حقیقی بہنیں ہیں۔ دونوں کی قواعد ایک ہے۔ افعال ایک ہیں، لفظیات کے بڑے حصے میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جب تک ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور اجنبی اصطلاحات شامل نہ کرلی جائیں، دونوں زبانوں کے مابین امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ غیر ہندی علاقوں میں اردو دوسری یا تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور ان علاقوں میں پسندیدہ اور مقبول بھی ہے۔ شمالی ہند میں باستثنائے کشمیر اب پورے ملک میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اردو سرکاری کام کاج میں دوسری زبانوں کے شانہ بشانہ نظر آتی ہو۔ اردو والوں نے ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ اپنی زبان کے رسم الخط کو بدلنے کی کوششیں کامیاب نہ ہونے دیں ورنہ اس کا وجود ختم ہوسکتا تھا۔

اردو کے مسائل کا ایک اور پہلو بھی ہے جو زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اس پہلو کا تعلق خود اردو والوں سے ہے۔ اردو زبان کی بدحالی کی جتنی داستانیں ہیں ان میں اردو والوں کی کوتاہ اندیشی، بے حسی اور غفلت شعاری کا ہاتھ ہے۔ اردو بولنے والے آتی جاتی حکومتوں سے شکوے شکایات کے عادی ہوچکے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کی بقا کا سارا انحصار سرکاری سرپرستی پر ہے حالانکہ زبانیں صرف حکومتوں کے بل پر زندہ نہیں رہتیں، سرکاری سرپرستی سے ان کی ترقی کی رفتار میں تیزی ضرور آجاتی ہے مگر اصلاً ان کے بولنے والے ہی ان کی زندگی اور ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ اردو بولنے والے اس بدیہی حقیقت سے آنکھیں چراتے رہے ہیں۔ اردو بولنے والوں کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جہاں تک

شمالی ہند کے مسلمانوں کا تعلق ہے، اردو ان کی مذہبی زبان کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ آج کے مسلمان جو عربی فارسی سے تقریباً نابلد ہیں اسی زبان کے وسیلے سے اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے روشناس کراسکتے ہیں۔ اردو کی بقا آج بے وجہ ان کی تہذیبی، تاریخی اور مذہبی ذمے داری بن گئی ہے۔ اسکولوں میں انتظام نہ ہونے کی صورت میں اگر وہ اپنے بچوں کو گھروں میں اردو پڑھائیں گے تو کوئی ان سے باز پرس کرنے نہیں آئے گا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندو مسلمان سبھی مل کر اردو زبان پڑھنا لکھنا سیکھتے تھے۔ آج اردو زبان سیکھنے والے غیر مسلم بچوں کی تعداد غیر ملکی زبانیں سیکھنے والے بچوں سے بھی کم ہے۔ اس طور پر اہل وطن نے اردو کی بقا کی ساری ذمے داری عملاً مسلمانوں کے سر پر ڈال دی ہے۔ کچھ غیر مسلم اردو پڑھنے لکھنے والے، خدا ان کا سایہ اردو کے سر پر تادیر قائم رکھے، اس زبان کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں ورنہ اسکولوں سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں تک نگاہیں دوڑاتے رہیے کہیں کوئی بھولا بھٹکا غیر مسلم طالب علم اتفاق سے اردو کی کلاس میں نظر آجاتا ہے اردو کی افسوسناک حالت کا ایک پہلو یہ ہے کہ دوسری زبانوں، خاص کر ہندی اور انگریزی کے ایسے اخبارات و رسائل خریدنے میں بھی اردو والوں کو کوئی عار نہیں جنھیں پڑھنے کے لیے نہ ان کے پاس وقت ہے اور نہ استعداد۔ مگر وہ اردو کے رسالے اور کتابیں نہیں خریدتے۔ یہ مرض ان حضرات میں زیادہ تشویشناک ہے جو اردو کے ذریعے ہزاروں لاکھوں کما رہے ہیں اور چھوٹے بڑے اداروں میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔

گذشتہ دہائیوں میں حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں نے اردو کے لیے کچھ عملی اقدامات کیے ہیں۔ مرکز میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ریاستوں میں اردو اکادمیاں انھیں اقدامات کا ثمرہ ہیں۔ اردو کے ان اداروں کو بجٹ کے ساتھ ساتھ خود مختاری بھی دی گئی ہے۔ لیکن بڑا کام صرف روپے سے نہیں اخلاص اور جذبے سے ہوتا ہے۔ دہلی، بہار اور اتر پردیش میں اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی بات کہی گئی ہے جو ایک نیک فال ہے۔ جب کسی زبان کا رشتہ روزی روٹی سے استوار ہوتا ہے تو اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات زیادہ روشن ہوجاتے ہیں۔ مگر اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ روزی روٹی کے علاوہ اس کا رشتہ دلوں سے بھی استوار ہو۔ جو بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں، ضرور پڑھیں مگر ان بچوں کو وہاں اردو پڑھنے کی سہولت بھی حاصل ہو۔ اسکول میں ممکن نہ ہو تو گھر میں اردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ اردو والے دوسری زبانیں بھی سیکھیں، ہندی اردو کی بہن اور وطن عزیز کی قومی زبان ہے، اسے سیکھنا نہایت ضروری ہے۔ انگریزی بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے، اسے بھی سیکھیں۔ مگر اردو کی قیمت پر نہیں، اردو کے ساتھ سیکھیں۔ آج اردو کے حق میں فضا نسبتاً سازگار ہے۔ حکومتوں کے دلوں میں نرم گوشے پیدا ہو رہے ہیں مگر افسوس کہ اردو کے مخلص جاں نثار کم ہوتے جا رہے ہیں۔ فی زمانہ صورت حال یہ ہے کہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ اپنی اپنی تہذیب اور تاریخ کی بات کر رہا ہے اور اپنی زبانوں کو زندہ رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اردو بولنے والے اپنی شیریں پُرکشش اور ادبی حسن و جمال سے مالامال زبان کو زندہ رکھنے کی ذمے داری قبول کرنے سے کتراتے ہیں۔

❑❑❑

پتہ:

Deptt. of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600

قیمت: -/300 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شفیع ایوب

عام بجٹ اور تعلیم

مرکزی وزیر مالیات پرنب مکھرجی کے ذریعے پیش کیے گئے بجٹ 10-2009 کو ''خراب حالات میں بہترین بجٹ'' قرار دیا جارہا ہے۔ جو ماہرین اقتصادیات بجٹ کی تعریف نہیں کرنا چاہتے، وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ موجودہ عالمی اقتصادی بحران کے دور میں اس سے اچھا بجٹ نہیں پیش کیا جاسکتا تھا۔ اس بجٹ میں سماج کے ہر طبقے کو اہمیت دی گئی ہے، اس بجٹ میں گاؤں دیہات کو اولیت دی گئی ہے، جب کہ شہروں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ یہی اس بجٹ کی کامیابی ہے، ہر چہار جانب سے اٹھنے والی آواز نے اس بجٹ کو معتدل بجٹ کہا ہے۔

لوک سبھا میں بجٹ پیش کرتے ہوئے وزیر مالیات پرنب مکھرجی نے اپنی تقریر میں کئی دفعہ ابھرتے ہوئے جوان ہندوستان کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ جوان ہندوستان کی خواہشات کا میں احترام کرتا ہوں۔ دراصل پورا بجٹ ہی جوان ہندوستان کی بات کریں گے تو تعلیم اور تعلیمی نظام کے ذکر کے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی۔ اسی کے پیش نظر وزیر مالیات نے بجٹ میں تعلیم پر خاص دھیان دیا ہے۔ حکومت اس حقیقت سے واقف ہے کہ سماجی شعبے میں اس سال کے عام بجٹ میں تعلیم کے لیے مختص رقم میں نو سو کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی تعلیم کے بجٹ میں مجموعی طور پر 36 ہزار چار سو کروڑ کا انتظام ہے۔ اس میں سے 26800 کروڑ روپئے اسکولی تعلیم کے لیے خرچ کیے جائیں گے اور باقی 9600 کروڑ روپئے اعلیٰ تعلیم کے لیے خرچ کیے جائیں گے۔ اس طرح اس بجٹ میں اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

گذشتہ حکومت نے پرائمری اسکولوں کے بچوں کے لیے دوپہر کے کھانے کی اسکیم کو منظوری دی تھی۔ اس وقت اس اسکیم کی اہمیت کو ٹھیک سے نہیں سمجھا گیا تھا۔ ہندوستان کی زمینی حقیقت سے ناواقف چند نام نہاد ماہرین نے اس اسکیم کی مخالفت کی تھی لیکن وقت نے اسے ثابت کردیا کیوں کہ محض کھانے کی غرض سے ہزاروں نہیں لاکھوں بچے اسکول کی طرف راغب ہوئے۔ غریب، نادار اور اسکول سے دور بچوں کو تعلیم سے قریب کرنے کی ذمے داری صرف ان کے والدین کی نہیں ہے بلکہ یہ ذمے داری سماج اور حکومت کی بھی ہے۔ حکومت نے اپنی اس ذمے داری کو نبھاتے ہوئے بجٹ 10-2009 میں دوپہر کے کھانے کی اسکیم کو اپر پرائمری درجات تک توسیع دے دی ہے۔

اگر لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی گئی تو تعلیم کے فروغ کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ اس اہمیت کو سمجھتے ہوئے وزیر مالیات نے موجودہ بجٹ میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے وظیفے پر خاص دھیان دیتے ہوئے اس مد میں رقم کا اضافہ کیا ہے۔ اس اضافہ شدہ رقم سے یقیناً اقلیتی طبقے کی لڑکیوں کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔ غریب خاندانوں کی اکثر لڑکیاں گھریلو کاموں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش میں ماں کا ہاتھ بٹانا ان کی ذمے داری بن جاتی ہے۔ ایسے میں وہ پڑھائی کی طرف بالکل دھیان نہیں دے پاتی ہیں۔ اس بجٹ میں آنگن واڑی پروگرام کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آنگن واڑی پروگرام میں چھ سال کی عمر تک کے بچوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق ملک کے آدھے سے زیادہ بچے غذائیت کی کمی کے شکار ہیں۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے آنگن واڑی پروگرام کی توسیع اس بجٹ میں کی گئی ہے۔ آنگن واڑی پروگرام کے تحت لاکھوں بچے تعلیم اور غذا دونوں حاصل کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ آنگن واڑی پروگرام میں ہزاروں خواتین کو ان کے گھر کے پاس روزگار ملا ہے۔ اس مد میں خرچ ہونے والی رقم میں تقریباً بیس فی صد کا اضافہ کیا گیا ہے۔

بجٹ 10-2009 میں سروشکشا ابھیان، مڈڈے میل اور ثانوی تعلیم پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ یقیناً اس بجٹ پر سچر کمیٹی کی سفارشات کا اثر بھی دیکھنے کو ملا ہے۔ جسٹس سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اقلیتوں کی تعلیم پر دھیان کم ہونے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ اس بجٹ میں اس کمی کو دور کرنے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ اس بجٹ میں اس کمی کو دور کرنے کی جانب قدم اٹھایا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی اپنی اہمیت وافادیت ہے لیکن بنیادی تعلیم کے نظام کو مضبوط کیے بغیر اعلیٰ تعلیم کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ وزیر مالیات نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا ہے کہ ملک میں پرائمری اسکولوں کی حالت خستہ ہے، غریب و نادار بچوں کے والدین پرائیویٹ اسکولوں کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتے۔ ایسے میں سرکاری پرائمری اسکول ہی ان کا سہارا ہیں اور یہی ان کے لیے تعلیمی امید کی ایک کرن ہیں۔ اس بجٹ میں کوشش ہوئی ہے کہ تعلیمی ڈھانچے کے ساتھ تعلیم کے معیار میں بھی بہتری لائی جاسکے۔ جواہر نوودے ودیالیہ اور کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ کی اسکیم نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں غریب خاندان کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرنے کا کام کیا ہے۔ اس بجٹ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ درج فہرست ذات اور درج فہرست قبائلی بچوں کے ساتھ اقلیتی طبقے کے بچوں کو بھی نوودے ودیالیہ اور کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ کی اسکیم سے

زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔

درمیان میں ہی تعلیم چھوڑ دینا بھی ہمارے ملک میں ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ شروع سے ہی اسکول نہ جانے والے بچوں میں ایک خاص قسم کی بے نیازی پائی جاتی ہے جب کہ درمیان میں ہی پڑھائی چھوڑنے والے بچوں میں ایک نفسیاتی کشمکش پائی جاتی ہے، ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ شروع سے ہی اسکول نہ جانے والے بچوں کو جب ہم کوئی ہنر سکھاتے ہیں تو وہ اکثر اس ہنر یا فن میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں جب کہ درمیان میں پڑھائی چھوڑنے والے بچے کام میں پوری طرح من نہیں لگا پاتے ہیں اور بعض مرتبہ تخریب کاری کے شکار ہو جاتے ہیں۔ درمیان میں پڑھائی چھوڑ دینے کے کئی اسباب ہیں، جن میں ماں باپ کی مالی حالت، ماں باپ کے آپسی خراب رشتے وغیرہ خاص سبب ہیں۔ درمیان میں پڑھائی چھوڑنے والے بچوں کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ایسے بچوں کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس لیے وزیر مالیات نے درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے والے طلبہ کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظیفے کا اعلان کیا ہے۔

تعلیم کے تئیں اس بجٹ میں ایک خصوصی پہلو یہ ہے کہ آئی ٹی آئی اداروں کے ساتھ ساتھ مدارس کی جدید کاری کے لیے خصوصی مالی پیکیج کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں مدارس کا اپنا ایک نیٹ ورک ہے۔ اس نیٹ ورک کو جدید سہولیات مہیا کرا کر تعلیم کے میدان میں ایک انقلابی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ بجٹ 10-2009 میں مدارس کی جدید کاری کے لیے الگ سے رقم مختص کر دی گئی ہے۔

بنیادی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کی اپنی خاص اہمیت ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہی کسی ملک و قوم کا سرمایۂ افتخار ہوتے ہیں۔ اس بجٹ میں اعلان کیا گیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے معیار میں بہتری کے لیے ویرپا موئلی کمیٹی کی سفارشات کو نافذ کیا جائے گا۔ جسٹس سچر کمیٹی کی رپورٹ میں اقلیتوں کی مالی حالت بدتر ہونے کی بات صاف طور پر کہی گئی ہے۔ مسلم طلبہ و طالبات اکثر مالی دشواریوں کے سبب ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تعلیم جاری نہیں رکھ پاتے ہیں۔ اس کے لیے موجودہ بجٹ میں وزارت برائے اقلیتی امور کو ایک رقم دینے کی تجویز ہے، جس سے اقلیتی طبقے کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے طلبہ کو فیلوشپ دی جائے گی۔ اس کے علاوہ یو جی سی سے ملنے والی فلوشپ میں اقلیتی طلبہ کی حصے داری پہلے کی طرح موجود رہے گی۔ اس سلسلے میں اقلیتی طبقے کے لیے ایک خوش آئندہ بات یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرز پر اقلیتوں کے لیے تین نئی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں گی۔ مجوزہ یونیورسٹیاں کرناٹک، بہار، اور راجستھان میں وہاں کے اوقاف کی کونسلوں اور وقف بورڈوں کی مدد سے قائم کی جائیں گی۔

مرکزی حکومت نے مختلف ریاستوں میں گذشتہ برس ہی چودہ نئی سنٹرل یونیورسٹیاں قائم کرنے کا بل پاس کر دیا تھا۔ اس بجٹ میں ان یونیورسٹیوں کے لیے بھی مالی مدد فراہم کر دی گئی ہے۔ ایک طرف نئے آئی آئی ٹی کھولنے کے لیے 450 کروڑ روپے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ طلبہ کو تکنیکی تعلیم حاصل کرنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوں، دوسری طرف اعلیٰ تعلیم کے مواقع بڑھانے کے لیے ایک سنٹرل یونیورسٹی کھولنے کے لیے 827 کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ اقلیتوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے مولانا آزاد فاؤنڈیشن کے لیے مختص کردہ رقم 60 کروڑ سے بڑھا کر 115 کروڑ کر دی گئی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شاخیں مرشد آباد (مغربی بنگال) اور ملاپورم (کیرالا) میں کھولنے کے لیے 25 کروڑ روپے دیے گئے ہیں۔ ہریانہ اور پنجاب کی راجدھانی چنڈی گڑھ میں واقع پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کو الگ سے 50 کروڑ روپے دیے گئے ہیں تاکہ یونیورسٹی میں نئے کورسیز کا آغاز ہو سکے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ مرکزی بجٹ 10-2009 میں دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ تعلیم پر بھی بھرپور توجہ دی گئی ہے۔

(بہ شکریہ "یوجنا" نئی دہلی)

□□□

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پوری کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت -/149 روپے

احسان حسن

اردو میں پی.ایچ.ڈی تحقیق کے مسائل

آج پی.ایچ.ڈی تحقیق کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں ناکامیابی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے یعنی پی.ایچ.ڈی میں کوئی فیل نہیں ہوتا۔ جس دن پی.ایچ.ڈی میں لوگ فیل ہونے لگیں گے اسی دن سے تحقیق کے تمام تر مسائل خشک پتوں کی مانند جھڑنے لگیں گے اور معیار و وقار کی نئی نئی کونپلیں پھوٹنی شروع ہو جائیں گی، جس سے ادب کے اس مکمل عمل میں رعونت اور بے حسی کی جگہ سبز داری کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ کیسے؟ ملاحظہ فرمائیں:

جب لوگ بی.اے اور ایم.اے کی طرح (راہ راست) پی.ایچ.ڈی میں بھی فیل ہونے لگیں گے تو نگراں حضرات اپنے عزیز و اقارب کی ضمانتیں لینے سے بچنا شروع کریں گے جس سے ادب میں (کبوتر بازی) اور گھس پیٹھ پر روک لگے گی۔ آج کے دور میں ادب کی دنیا میں داخل ہونے کے نام پر مدرس بننے، مقام کو ہتھیانے کے لیے پی.ایچ.ڈی کو جس طرح ایک ہی چھلانگ میں مزے سے پار کر جانے کی روش پڑ گئی ہے اس سے نہ صرف ادب کی سرحدیں کمزور ہوئی ہیں بلکہ اردو اعلیٰ تعلیم کا معیار بھی گرا ہے۔ پی.ایچ.ڈی میں ناکام ہونے کے بندوبست سے ادب کی سرحدیں محفوظ ہوں گی جس سے ادب کے اندرونی انتشار و خلفشار سے نجات ملے گی اور ایک غیر جانب دارانہ و منصفانہ نظام علم و ادب قائم ہو سکے گا۔ محنتی، ایماندار اور اہل قلم لوگوں کی شناخت آسان ہوگی جس سے انھیں وہ مناسب اہمیت مل سکے گی جس کے کہ وہ مستحق ہیں، ورنہ بھیڑ کا حصہ بنی نہ جانے کتنی ذہانتیں دم توڑ کر دفن ہوتی رہیں گی۔

جب لوگ پی.ایچ.ڈی میں فیل ہونے لگیں گے تو تحقیق کے لفظوں کے ہیر پھیر سے کام چلاتے ہوئے موضوعاتی تکرار پیدا کرنے اور پھر ریسرچ کے نام پر ادھر کا مال ادھر کرنے کی گنجائش ختم ہو جائے گی۔ اس سے علم و ادب کو دو طرفہ فائدہ ہوگا: ایک تو ادب کے پوشیدہ اور تاریک گوشوں کی تلاش ہوگی۔ دوسرے، تحقیقی مقالوں میں ضخامت پر ذہانت کو ترجیح ملے گی، جس سے مقالے مربوط، مضبوط، مؤثر اور معقول بن سکیں گے۔ ظاہر ہے یہ اثرات مواد کی سطح پر تو ہوں گے ہی ساتھ ہی ساتھ اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے بھی ترقی و تبدیلی کا باعث بنیں گے۔

ویسے سیکھنا سکھانا تو تمام عمر چلتا رہتا ہے لیکن پی.ایچ.ڈی تحقیقی مقالے کو ''ایک طالب علمانہ کوشش'' کہہ کر رعایت پانا قابل مذمت ہے۔ جب لوگ پی.ایچ.ڈی میں فیل ہونے لگیں گے تو یہ شریفانہ بہانہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ آخر ہمارے سامنے خلیل الرحمن اعظمی، وقار عظیم، گیان چند جین، عقیل رضوی، محمود الٰہی وغیرہ کی مثال موجود ہے کہ ان حضرات کا پی.ایچ.ڈی کا تحقیقی مقالہ ہی ان کی ادبی حیثیت کا ضامن بنا اور ان مقالوں کی علمی و ادبی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔

چونکہ پی.ایچ.ڈی تحقیق ریسرچ اسکالر اور نگراں کے مابین ایک دوطرفہ عمل ہے اس لیے اس میں ناکامی دونوں کے لیے مشترکہ طور پر باعث ندامت ہوگی، جس سے کئی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے مثلاً جو نگراں حضرات پڑھتے لکھتے نہیں وہ پڑھنا شروع کریں گے۔ جب پڑھیں گے تو پڑھائیں گے بھی اور تحقیق میں اصل و نقل پر گرفت برقرار رکھ سکیں گے۔ ظاہر ہے، اس سے تحقیق کو نہ صرف واضح سمت ملے گی بلکہ ریسرچ اسکالر کا فکری شعور بھی بلند ہوگا۔ جو ریسرچ اسکالر نگراں کی جی حضوری اور خوش آمد کو ہی اپنی کامیابی کا راز سمجھتے ہیں انھیں اس وہم سے نجات ملے گی اور وہ سنجیدگی سے مطالعے کی طرف متوجہ ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تحقیق کرنے اور تحقیق کرانے دونوں ہی صورتوں میں سرگرمی بڑھے گی جس سے صحت مند و فکر انگیز مباحثوں کی شروعات ہوگی اور غور و فکر کی مختلف جہتوں کے امکان روشن ہو سکیں گے۔ یہی پی.ایچ.ڈی اور اعلیٰ تعلیم کا صحیح معنوں میں مقصد بھی ہے۔

جب لوگ پی.ایچ.ڈی میں فیل ہونے لگیں گے تو جانب دارانہ رویے کمزور پڑیں گے جس سے ادب میں توازن پیدا ہوگا۔ اکثر نگراں حضرات کسی مخصوص رجحان سے وابستگی کی بنا پر اسی سے متعلق ریسرچ کراتے ہیں اور پھر رجحان کے بحث طلب پہلوؤں پر انتہا پسندی کی حد تک جا کر اپنے رجحان کی طرف داری کرتے ہیں۔ نتیجے میں مقالہ تو یک رخی ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ مقالہ نگار یعنی ریسرچ اسکالر کی ذہنیت بھی یک رخی ہو جاتی ہے۔ اس طرح ادبی گروہ بندی اور ادبی سیاست بازی کی نئی نسل تیار ہوتی ہے۔ صحت مند حریفانہ رویے زبان و ادب کو فروغ عطا کرتے ہیں لیکن جب ادبی رویوں میں

ذاتی اغراض و مقاصد شامل ہو جاتے ہیں تو پھر بے ادبی کو ہی فروغ ملتا ہے۔

جب لوگ پی. ایچ. ڈی میں فیل ہونے لگیں گے تو ابہام و تفہیم کے نام پر وہم و ابہام پیدا کرنے کی عادتیں خود بخود چھوٹ جائیں گی۔ جو لوگ فکر کی کم مائیگی اور معلومات کی کمی کو تشریح و تفصیل کے دامن میں چھپاتے ہیں اور گول مول سی باتیں کرتے ہوئے نکل جاتے ہیں انھیں براہِ راست عرض و معروض سے رشتہ جوڑنا پڑے گا۔ جس سے ادب میں صاف گوئی کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس سے مواد کو تو مضبوطی ملے گی ہی ساتھ ہی ساتھ اسلوب میں بھی پختگی آئے گی۔

آج پی. ایچ. ڈی. کو لوگوں نے اپنے اپنے طور پر مختلف مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ مثلاً کوئی اپنی Marital qualification میں اضافے اور کنوارے پن کی طوالت کو گزارنے کی غرض سے پی. ایچ. ڈی کرتا ہے تو کسی کو '' ڈاکٹر صاحب '' کہلانے کی حسرت اس طرف مائل کرتی ہے۔ اس سے پی. ایچ. ڈی برائے پی. ایچ. ڈی کا مقصد رکھنے والوں کا بڑا نقصان ہوتا ہے اور نہ صرف پی. ایچ. ڈی کا معیار و وقار گھٹتا ہے بلکہ عقل و دانش کی بے قدری بھی ہوتی ہے۔ فیل ہونے کے بندوبست سے پی. ایچ. ڈی میں غیر سنجیدہ اور علم و ادب کے مزاج سے ناآشنا لوگوں کی آمد پر روک لگے گی کیوں کہ یہی لوگ تحقیق کی دشواریوں اور مواد کی نافراہمی کا رونا روتے ہیں۔ یوں تو کام کرنے کے سو بہانے ہیں، نہ کرنے کے ہزار۔ آخر جو لوگ خونِ جگر صرف کرنے کا جذبہ نہیں رکھتے انھیں اس میدان میں آنے کی ضرورت ہی کیا ہے! رشید احمد صدیقی کا قول دُہرانا چاہوں گا کہ:

'' آرٹ اور ادب بھی کربلا ہیں، جہاں شہادت نہیں تو کچھ نہیں۔''

آج اردو میں پی. ایچ. ڈی. تحقیق کے تمام تر مسائل کی بڑی وجہ اس تعلیمی درجے میں فیل نہ ہونے کی ضمانت ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر غور کر کے اہلِ فکر و نظر کو اس کا حل نکالنا چاہیے۔

□□□

پتہ:
Deptt of Urdu
Allahabad University, Allahabad
Allahabad, (U. P.) 211002

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیّدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بہ یک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعرگوئی بھی تھا۔
یہ اس کی مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

صفحات: 824

قیمت: -/157 روپے

کلیاتِ سراج

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔
دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن) صفحات: 732

قیمت: -/138 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

کرتار سنگھ

ایک اردو دوست کا توجہ طلب خط

ذیل میں ہم جناب کرتارسنگھ (انچارج سنہری پبلک اسکول، مالیرکوٹلہ) کا خط جو ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کے نام ہے، درج کررہے ہیں۔ خط میں انھوں نے قومی اردو کونسل کی کارگزاریوں پر عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے اور "اردو دنیا" کے مشمولات سے بھی وہ مطمئن نہیں ہیں۔ اردو کونسل کی کوشش یہی رہی ہے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے جو کچھ کیا جاسکتا ہے، کیا جائے۔ "اردو دنیا" عمومی نوعیت کا ادبی رسالہ نہیں ہے، اس کا اولین مقصد اردو قارئین کو بحالاتِ موجودہ تعلیم و تدریس کی غیر معمولی اہمیت کا احساس کرانا نیز انھیں عصری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے باخبر رکھنا ہے۔ ہم اپنی اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہیں جس کا اندازہ ان سینکڑوں خطوط سے ہوتا ہے جو ہمیں ملتے ہیں اور جن میں سے کچھ ہم "آپ کی بات" کے تحت ہر مہینے شائع بھی کرتے ہیں۔ بہرحال کرتارسنگھ صاحب نے جس جذبے سے خط لکھا ہے، ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ خط میں کچھ اور باتیں بھی ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ خط جوں کا توں نذر قارئین ہے۔ (ادارہ)

(جیسا کہ میرے پیڈ سے ظاہر ہے کہ) میں سول سپلائی محکمے سے بطور آفیسر ریٹائر ہوا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اسٹڈی سینٹر مالیرکوٹلہ سے اردو میں ڈپلوما حاصل کیا۔ مجھے اردو سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ سینٹر کے انچارج جناب محمد شفیق انصاری صاحب نے میری بہت مدد کی ہر طرح سے گائڈ کیا۔ دو سال تک میں اردو میں آگے کچھ نہ کر سکا بلکہ جو پڑھا تھا وہ بھی بھولنے لگا تو مجھے بہت پریشانی ہوئی اور اس پریشانی کا حل پھر شفیق صاحب سے پوچھا انھوں نے مجھے صلاح دی کہ مشق ہی سب کچھ ہے۔ کوئی ویاکرن اتنی مدد نہیں کرتا جتنی مشق کرتی ہے، انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں باقاعدہ "اردو دنیا" پڑھنا شروع کردوں۔ یہ بھی کیا فائدہ نہیں ہوا۔ اس "اردو دنیا" کو میں سمجھ نہیں سکا یہ ایک رسالہ ہے یا کہ دفتر کی رپورٹ اس میں رسالے جیسا تو کچھ بھی نہیں۔ اپریل 2009 سے باقاعدہ یہ رسالہ پڑھ رہا ہوں۔

قومی کونسل کا دعویٰ ہے کہ وہ اردو کے لیے کچھ کر رہی ہے۔ کونسل اردو کی ترقی کے لیے کچھ نہیں کر رہی یا کیا کر رہی ہے ظاہر نہیں ہو رہا۔ جب سے میں نے اردو سیکھی ہے کم سے کم میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب میں پٹیالہ سے چنڈی گڑھ تک اگر آپ پیدل بھی چلیں تو راستے میں ایک بھی لفظ اردو کا لکھا آپ کو نہیں ملے گا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ دہلی یا اور جگہ پر شاید اردو لکھی مل جائے۔

میں ایک بار میونسپل کے دفتر گیا تو وہاں سب لوگ ایک کاغذ کے ٹکڑے کو سامنے رکھ کر پریشان۔ وجہ تھی کہ وہ ڈاکومنٹ اردو میں تھا اور وہاں کوئی بھی اردو جاننے والا تھا نہیں۔ جب میں نے اس ڈاکومنٹ کو پڑھ کر سنایا، اس وقت میں دنیا کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی محسوس کرنے لگا۔ ایسے حالات میں اردو کی ترقی کی بات اونچی آواز میں کرنا کہاں تک فخر کی بات ہے۔ میں یہ نہیں لکھ رہا کہ کونسل اردو کی ترقی کے لیے کچھ نہیں کر رہی پر وہ پرانے طریقے پر چل رہی ہے۔ نئی روشنی، نئے اصولوں اور حالات کی ضرورت کے مطابق ہونے کی ضرورت ہے۔ جہاں رسالے میں صرف چند لوگوں کے لیکھ اور صرف چند لوگوں کے بارے میں جنھیں عام لوگ جانتے بھی نہیں لکھا جاتا ہے۔ جبکہ کلاکار راجنیتک، کوی، ڈاکٹر، جمہوریت، عورتوں کے حق، بچوں کی عادتوں اور ان کے سدھار کے بارے میں لکھنا چاہیے۔ بہت کم لفظوں میں۔ میگزین میں ایسی کشش ہو کہ پڑھنے والا اس کا بے صبری سے انتظار کرے اور ہر کسی کے لیے کچھ نہ کچھ اس کی پسند کا ملے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کی روچی اس طرف بڑھائیں تاکہ اردو کی ترقی ہو تو کیا ہم بڑوں کے لیے اس میں کشش نہیں رہی۔ گھسے پٹے مضمون جن میں عام آدمی کو کوئی دلچسپی نہیں۔ قومی کونسل کے پاس دلیل ہے کہ وہ "اردو دنیا" چلا رہے ہیں اور ساتھ میں اردو کی ترقی کے لیے اسٹڈی سینٹر بھی چلا رہے ہیں۔ جن لوگوں نے ان سینٹروں سے ڈپلوما لیا ہے وہ اس وقت جنگل میں ہیں۔ گذارش ہے کہ ان ڈپلوما ہولڈروں کو آگے ڈگری وغیرہ دینے کا انتظام کیا جاوے۔ ایک بچے کو چلنا سکھا دیا اور چھوڑ دیا بے سہارا۔ مسلمان ہمارے ملک کا ایک بہت بڑا حصہ ہیں اور مولانا آزاد کے بعد مسلمانوں نے کوئی بھی لیڈر ملک کو نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے حق کے لیے لڑنا نہیں سیکھتے اور دوسروں کی مہربانیوں پر جینا سیکھ لیا ہے۔ یہ بات بہت دکھ دینے والی ہے۔ جب تک بچہ روتا نہیں ماں دودھ نہیں دیتی۔ ارجن سنگھ کی سوچ الگ تھی اب ہمارے منتری کپل سبل بہت ہی انصاف پسند اور کھلے وچاروں والے ہیں میں چاہوں گا کہ کونسل ان کی مدد لے۔ ہر سرکاری اسکول میں اردو کا ایک سبجیکٹ ضروری کیا جاوے اردو سیکھنے والے بہت ہیں مگر سکھانے والے کم ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اب تک میں نے نو آدمیوں کو اردو کی جانکاری دی جتنی مجھے تھی۔

آخر میں صرف ایک گذارش ہے کہ "اردو دنیا" رسالے کو اور دلچسپ بنایا جائے۔ یہ اردو کو گھر گھر پہنچانے کا کارگر ہتھیار ہے۔ ☐☐☐

پتہ:
#H-4/2, Adarsh Colony, Rajpura, Punjab

عبدالغفار شکیل

ٹیپو سلطان اور مولانا آزاد

تحریکِ آزادیِ ہند میں حصہ لینے والے مجاہدین میں ٹیپو سلطان شہیدؒ کا نام سرفہرست ہے جن کی جلائی ہوئی مشعل آزادی کے علمبرداروں میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی ہیں۔ مولانا آزاد کو حیدر علی خاں اور ان کے نامور فرزند ٹیپو سلطان سے بڑی عقیدت تھی۔ مولانا ان دونوں کے جذبۂ حریت اور وطن کے لیے قربانیوں کے بے حد معترف تھے اور ان کے کارناموں کو جو تاریخ ہند کا ایک روشن باب ہیں، محفوظ کرنے کے خواہاں تھے۔ مولانا آزاد نے اپنے کلکتہ کے قیام کے زمانے میں اپنے دوست غلام رسول مہر کو ایک خط لکھا تھا جس کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

''......ٹیپو سلطان کی جس کتاب کا ذکر کیا تھا، تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہی کتاب ہے جس میں فرنچ قواعد جنگ کو فارسی میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہ وکٹوریہ میموریل ہال کی چیزوں میں ہے لیکن نگرانی کلکتہ میوزیم کی ہے۔ اگر اس کی ضرورت ہو تو حاصل کی جاسکتی ہے۔

حیدر اور ٹیپو کے لیے جن انگریزی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے غالباً وہ آپ نے جمع کرلی ہوں گی۔ چارلس اسٹوارٹ کی میمویرس آف حیدر علی اینڈ ہز سن (Memoirs of Hyder Ali and His son)، بیٹسن کی ''اے ریویو آف دی اوریجن اینڈ کانڈکٹ آف دی وار (A Review of the origin and conduct of the war with Tipu) اور این آفیسر ان دی ایسٹ انڈیا کمپنیز سروس کی آتھینٹک میموریز آف ٹیپو (Thentic Memoirs of Tipu) دوسری اور آخری جنگ کے زمانے میں لکھی گئی تھیں اور کتب خانوں میں مل سکتی ہیں۔ ایک فرنچ افسر ایم. ایم. ڈی. ایل. ٹی نے حیدر علی کے حالات 1781 میں لکھے تھے اور لندن میں شائع ہوئے تھے۔ پرنس غلام محمد نے اس کی نقل کلکتہ میں چھپوا کر غدر سے پہلے شائع کی تھی۔ حیدر علی کے لیے یہ سب سے بہتر کتاب ہے۔ ان کے علاوہ اس عہد کے سرکاری ڈسپیچوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو شائع ہو چکے ہیں۔ خصوصاً لارڈ کارنوالس اور ویلسلی (Weleslay) کے، والٹر ہملٹن (Walter Hamilton) کے ایسٹ انڈیا گزٹ میں بھی حیدر اور ٹیپو کی جنگوں کی تفصیلات مل سکتی ہیں۔

فارسی کتابوں میں صرف تین کتابیں قابل اعتنا ہیں۔ لالہ کھیم نرائن کی ''فتوحات حیدری''، حسین علی کرمانی کی ''نشان حیدری'' اور مولوی عبدالرحیم کی ''کارنامۂ حیدری'' پہلی دو کتابیں شائع نہیں ہوئیں۔ لیکن مولوی عبدالرحیم کے پیش نظر تھیں۔ ان کے تمام ضروری حصے انھوں نے اپنی کتاب میں لے لیے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نقل کرلیے ہیں۔ اس میں حیدر علی کے خاندان کو عربی اور شاہی خاندان بنا دینے کی جو کہانی لکھی ہے وہ یقیناً فرضی ہے لیکن عام حالات مستند سمجھنے چاہئیں۔''

اس خط کی روشنی میں ہمیں مولانا آزاد کے تاریخی شعور کا پتا چلتا ہے۔ اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود مولانا کا حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ذوق و انہماک اور اہم تاریخی کتابوں کا حوالہ اور ان کے بعض بیانات کو فرضی تصور کرنا ایسی باتیں ہیں جن سے مولانا کے تاریخی شعور کی گہرائی اور گیرائی کا انداز ہوتا ہے۔

اس طویل خط میں مولانا غلام رسول مہر کو مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے:

''ٹیپو سلطان کے خاندان کے قبضے میں چند کتابیں اور بھی تھیں۔ یہ لوگ چونکہ والد مرحوم کے مرید تھے اس لیے اکثر گھر پر آتے رہتے تھے اور بچپنے کی بات یاد ہے کہ کئی قلمی کتابوں کا ذکر کرتے تھے۔ لیکن بعد کو جب خیال ہوا اور ان کتابوں اور یادداشتوں کو دیکھنا چاہا تو انقلاب حال نے سارا کارخانہ برہم کردیا تھا۔ کوئی چیز بھی کسی کے قبضے میں باقی نہیں رہی تھی۔ اب پرنس غلام محمد کے خاندان میں صرف غلام حسین باقی ہیں۔ میں نے انھیں کہلایا ہے کہ اگر کوئی کتاب باقی ہو تو اس کا سراغ لگائیں۔

ملا فیروز نے جارج نامے میں لڑائیوں کا حال نظم کیا ہے وہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ کہیں وہ تمام تر انگریزی بیانات کی نقل ہے تاریخی حیثیت سے لائق اعتنا نہیں، البتہ اس سے یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ حیدر علی کی عظمت اور ٹیپو کی شجاعت کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ جو نظم انگریزوں کی مداحی میں لکھی جارہی تھی وہ بھی اس کی جھلک سے اپنے کو بچا نہ سکی......''

اس خط کے ذریعے ایک اہم بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان کے خاندان کے لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد کے مریدوں میں سے تھے۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے خاندان ٹیپو کے افراد کو پہلے ویلور (تمل ناڈو) میں پھر کلکتہ لے جاکر آباد کیا۔ ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کے

والد مولانا خیرالدین کلکتہ میں مقیم تھے اور بے شمار لوگ ان کے مرید تھے۔

غلام رسول مہر کے نام ایک اور خط مورخہ 30 ستمبر 1937 میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اس وقت خیال ہوا کہ حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کے حالات لکھتے ہوئے وہ کتابیں بھی سامنے رکھنی چاہئیں جو بعض انگریز قیدیوں نے رہائی کے بعد لکھی تھیں۔ اس سلسلے میں تین تحریروں کا حوالہ دیا جاتا ہے: جیمس برسٹو کی سرگذشت، کرنل بیلی کے ایک آفیسر کا جرنل اور جیمس سکری کی لائف۔

حال ہی میں ٹرالوزلا نے ان تینوں رسالوں کا ایک مجموعہ کیپٹوز آف ٹیپو (Captives of Tipu) کے نام سے شائع کردیا ہے اور عام طور پر فروخت ہورہا ہے۔ اگر آپ نے یہ کتاب ابھی نہ لی ہو تو بہتر ہے منگوا لیجیے۔ ان لوگوں نے قید و بند کے جو شواہد بیان کیے ہیں انھیں احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ خصوصاً سکری کے بیانات۔ بہرحال یہ دوسرا سوال ہے۔ سر دست یہ مقصود ہے کہ موضوع کا خام مواد جمع کرلینا چاہیے۔''

ضمناً ٹیپو سلطان کا ذکر فرنچ اور عربی کی بعض کتابوں میں بھی آگیا ہے اور میری نظر سے گزرا ہے۔ مثلاً سفارت فرانس کا پیرس (Paris) میں واد اور ڈھاکہ ململ کا تحفہ جس کا میری انطوانیت نے گون بنایا تھا اور بطور یادگار کے میڈم کو دیا تھا۔ نیز ایک معمولی قسم کا طوطا جو ٹیپو کا سفیر سلطان کے لیے قسطنطنیہ لے جارہا تھا قاہرہ میں دیکھا گیا تھا اور دوسرے کا ذکر جبرتی کی تاریخ میں ہے۔ میڈم کیمپان (Kampan) کی میموئرس کا ترجمہ چھپ چکا ہے۔ جبرتی کی ''عجائب الاسفار'' ابن خلکان کے حاشیے پر ہے اور الگ بھی چھپ چکی ہے۔ پہلی سفارت کے ورود کا ذکر پرنس لامبال کے میموئرس میں بھی ملتا ہے۔ اس تقریب سے کہ سفراء کے ورود کے دربار میں وہ شریک نہ ہوسکی کیونکہ ڈافن چیچک میں مبتلا تھا اور اس کی تیمارداری میں لگی تھی۔

کتاب دیکھے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ محض حافظے سے لکھ رہا ہوں۔ اس کے انگریزی کے ترجمے کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

''تحفۃ المجاہدین'' سید زین العابدین شوستری نے مرتب کی تھی۔ غالباً یہ ان سفرائے ایران میں سے تھا جو کریم خاں ژند نے حیدرعلی کے خط کے جواب کے ساتھ بھیجے تھے لیکن میسور میں مقیم ہوگیا تھا۔ یہ ترکی سے بھی واقف تھا۔ بہت سی مصطلحات اس نے ترکی سے اختیار کی ہیں۔

فرنچ کی کئی کتابیں حیدرعلی اور ٹیپو کے حالات میں لکھی گئی ہیں جن کا انگریزی ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ کسی ماہر سے اس بارے میں خط و کتابت کرلی جائے۔ بہتر ہوگا کہ موسیو فلیشے سے خط و کتابت کیجیے جو نیشنل لائبریری کے مہتمم ہیں۔

(والسلام ابوالکلام)

مورخہ 4 اکتوبر 1937 کے خط میں مولانا غلام رسول مہر کو مولانا آزاد نے مزید لکھا:

''عزیزی! خط پہنچا۔ میں نے اس مضمون میں میڈم کامپاں اور پرنس دی لاسال کی یادداشتوں کا حوالہ دیا تھا، ان دونوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور میرے پاس موجود ہے۔ میرا نسخہ فرانس کی خودنوشتہ سوانح عمریوں اور یادداشتوں کے ایک پورے سلسلے کا جزو ہے جو امریکا سے شائع ہوا ہے اس میں سات آٹھ کتابیں آگئی ہیں لیکن یہ کتابیں الگ الگ بھی چھپی ہیں۔ لیکن ان میں حیدرعلی اور ٹیپو کے بارے میں کوئی ایسا مواد نہیں مل سکتا جس کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہو۔ صرف ٹیپو کا ضمناً ذکر ہندوستانی ململ کے ایک گون کا ذکر ہے جو ٹیپو کے فرستادہ تحفے سے میری انترانیت (موئس شانزدہم کی بیوی) نے بنوایا تھا اور اسے بطور یادگار کے دیا تھا.....''

(والسلام علیکم، ابوالکلام)

ان خطوط کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی تاریخ اور ان کے کارناموں سے گہری دلچسپی تھی اور مولانا نے دونوں کے بارے میں دستیاب کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ دراصل مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ خطوط حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کے سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر کے چند استفسارات کے جواب تھے۔ مولانا مہر نے مولانا آزاد کے خط پر حاشیے میں لکھا ہے:

''میں اس زمانے میں ''ٹیپو سلطان'' کتاب لکھنے کا ارادہ کررہا تھا اور مولانا سے میں نے ماخذ کے بارے میں استفسار کیا تھا، بلکہ تین سو صفحات لکھ بھی لیے تھے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کے مندرجہ بالا خطوط کے اقتباسات سے ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے:

1. ٹیپو سلطان کے خاندان کے افراد کو ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد کلکتہ لے جایا گیا تھا۔ مولانا آزاد کے والد خیرالدین کلکتہ میں مقیم تھے اور مشہور و معروف مرشد اور خطیب تھے۔ خانوادۂ ٹیپو سلطان کے افراد بھی بقول مولانا آزاد مولانا خیرالدین کے مرید تھے۔

2. مولانا آزاد کی نظر سے مختلف زبانوں میں لکھی گئی کتابیں گزری تھیں جو حیدرعلی اور ٹیپو سلطان سے متعلق تھیں۔ مولانا آزاد نے جن جن کتابوں کا ذکر اپنے خطوں میں کیا ہے ان میں سے بعض تو معروف ہیں اور بعض کا نام یا تذکرہ مطبوعہ کتابوں میں نہیں ملتا۔

مولانا آزاد اگرچہ مورخ نہ تھے لیکن محقق ضرور تھے۔ حیدرعلی اور ٹیپو سلطان پر تحقیقی کام کرنے کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ مستند حوالے

جمع کیے جائیں اور پھر تاریخ لکھی جائے۔ غیر مستند باتوں کو نظر انداز کیا جائے نیز یہ کہ مختلف زبانوں میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں اور اب تک منظر عام پر نہیں آئی ہیں ان پر کام ہو اور انھیں شائع کیا جائے۔ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں درج باتوں کو آنکھ بند کر کے قبول نہ کیا جائے بلکہ احتیاط کے ساتھ انھیں قبول کیا جائے کیونکہ انگریزوں نے، جو ٹیپو سلطان کو اپنا سخت دشمن سمجھتے تھے اور کسی صورت انھیں ختم کر دینے کے در پے تھے انھوں نے اپنی تاریخوں میں جو کچھ لکھا وہ پورا سچ نہیں۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ فرنچ زبان میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کا انگریزی میں ترجمہ ہوتا، تاکہ بہت سی ایسی باتیں جو انگریزوں نے ٹیپو سلطان کے بارے میں غلط سلط لکھ دی تھیں ان کی تکذیب ہو سکے۔ فرانسیسی لوگ ٹیپو سلطان کے حلیف تھے۔ ان کی لکھی ہوئی تاریخ میں سچائی بیان ہوئی ہے۔ پروفیسر سلطان کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں پروفیسر شیخ علی نے فرانس میں دستیاب تاریخی مواد کی ورق گردانی بھی کی ہے اور بہ حیثیت ایک غیر جانبدارانہ مؤرخ کے صحیح نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس طرح قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بھی پروفیسر محب الحسن کی "تاریخ ٹیپو سلطان" شائع کی ہے جس میں تاریخی حقائق بڑی چھان بین اور جستجو کے بعد پیش کیے گئے ہیں۔

یہ بھی پتا چلا ہے کہ مولانا آزاد کے ذاتی کتب خانے میں بہت سی نایاب او رواہم کتابیں حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے متعلق تھیں۔ قیاس کہتا ہے کہ مولانا آزاد نے ضرور انھیں پڑھا ہوگا لیکن مولانا غلام رسول مہر کو انھوں نے جو خط لکھے وہ قلم برداشتہ لکھے۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے بارے میں ان کے حافظے میں جو کتابیں محفوظ تھیں ان کے نام لکھ دیے اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ یہ باتیں صفحۂ قرطاس پر آگئیں۔ مولانا آزاد کے اس ذاتی کتب خانے کا کیا ہوا، وہ کتابیں اب کس کے پاس ہیں؟ اس کا علم کسی کو نہیں۔ اگر یہ کتابیں دستیاب ہو پاتیں تو حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی ازسرنو تاریخ لکھنے میں بہت مفید و معاون ثابت ہوں گی جس کی بہت ضرورت ہے، آزاد ہندوستان کی نئی تاریخ کے لیے۔

□□□

پتہ:
51, 2nd Main, Near Post Office,
Bannimantap-A, Mysore-570015

آندھی (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کر لے۔ فلم "آندھی" کا یہ منظر نامہ کملیشور کے ناول "کالی آندھی" پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ مجموعی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کی خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت -/65 روپے

جدید سیاسی فکر

مصنف: ڈاکٹر سید انوار الحق حقی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

اس کتاب میں جدید سیاسی فکر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی فلسفیوں پر گفتگو کی گئی ہے جنھوں نے اس مدت میں عالمی سیاست پر اثر ڈالا اور مختلف حکومتی نظاموں کی تشکیل یا استرداد دونوں کا موجب بنے۔ قدامت پسندی، افادہ پسندی، عینیت، ثبوتیت، قانونیت، اشتراکیت اور اس کے مختلف مکاتب فکر، سیاسی تکثیریت، مملکت مخالف نظریات، جمہوریت مخالف نظریات، مہاتما گاندھی کا عدم تشدد کا نظریہ اور سرودیہ تحریک ـــ یہ کتاب ان تمام عنوانات پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔

صفحات: 305، قیمت -/120 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

پردیپ جین

منگل سوتر — ادھورے ناول کا پورا قصہ!

منشی پریم چند نے اپنی زندگی میں کل 14 ناول تصنیف کیے۔ ان کا پہلا ناول ''اسرارِ معابد'' کے عنوان سے بنارس کے ایک غیر معروف ہفت روزہ ''آوازۂ خلق'' میں 8 اکتوبر 1903 سے قسط وار شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ 33 برس بعد 8 اکتوبر کو ہی پریم چند نے بنارس میں اس دنیائے فانی سے رحلت کی۔ پریم چند کا یہ پہلا ناول پنڈت رتن ناتھ سرشار کے رنگ میں لکھا گیا تھا اور اس میں نومشقی کی تمام خامیاں موجود تھیں۔ پریم چند کا یہ پہلا ناول یکم فروری 1905 تک چھپنے کے باوجود نا تمام رہ گیا۔ یہ ناول غالباً پریم چند کی زندگی میں کتابی صورت میں شائع بھی نہیں ہوا۔ اسی طرح پریم چند کا آخری ناول ''منگل سوتر'' جو انھوں نے اپنی آخری بیماری کے دوران لکھنا شروع کیا تھا عمر کی بے وفائی کی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ ''اسرارِ معابد'' کے برعکس ''منگل سوتر'' میں پریم چند کا فن اپنی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے اور بعض نقادوں کا یہاں تک کہنا ہے کہ اگر یہ ناول مکمل ہو جاتا تو پریم چند کا بہترین ناول شمار کیا جاتا۔

''منگل سوتر'' کے متعلق عام طور پر یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس کی پہلی اشاعت پریم چند کی رحلت کے تقریباً 12 برس بعد 1948 میں ہوئی۔ پریم چند جیسے ادیب کی کسی تخلیق کا 12 برس تک گمنامی کے اندھیروں میں رہنا تحقیق کی تحریک دیتا ہے۔ لہٰذا درج ذیل سطور میں ''منگل سوتر'' کے زمانۂ اشاعت پر مفصل بحث پیش خدمت ہے۔

منشی پریم چند کا مشہور ناول ''گئودان'' پہلی مرتبہ ہندی میں 20 مئی 1936 کو منظرِ عام پر آیا تھا۔ یہ ناول شروع کرنے کی اطلاع دیتے ہوئے منشی پریم چند نے منشی دیا نرائن نگم کو اپنے خط مورخہ 29 فروری 1932 میں تحریر کیا:

''ادھر ''غبن'' کا ترجمہ بھی شروع کر دیا ہے۔ ایک نیا ناول بھی شروع کر دیا ہے۔'' (چٹھی پتری، جلد نمبر 1، صفحہ 192)

فروری 1932 کے ہی ''ہنس'' میں پریم چند کا خود نوشت حالاتِ زندگی پر مبنی ایک مضمون بعنوان ''جیون سار'' بھی شائع ہوا تھا جس کے حوالے سے مدن گوپال نے پریم چند کے آخری نا تمام ناول ''منگل سوتر'' کی تصنیف کے متعلق ایک دلچسپ اطلاع دیتے ہوئے رقم کیا:

''رنگ بھومی (چوگانِ ہستی) کے ناشر دلارے لال بھارگو نے پریم چند کے مضمون ''جیون سار'' (''ہنس'' فروری 1932) کو پڑھ کر ان کو صلاح دی تھی کہ وہ اپنی سوانح کی بنا پر ایک ناول لکھیں۔ اس کا عنوان بھی سوچا گیا۔''

(کلیاتِ پریم چند، جلد نمبر 8، صفحہ xiii)

اس کے برعکس مسز پریم چند شورانی دیوی رقمطراز ہیں:

''مئی 1936۔ ''گئودان'' چھپ چکا تھا۔ ''منگل سوتر'' کا پلاٹ سوچ رہے تھے۔'' (پریم چند: گھر میں، صفحہ 330)

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اپنا مضمون ''جیون سار'' لکھ لینے کے فوراً بعد پریم چند ''گئودان'' جیسے ضخیم ناول کی تصنیف میں مصروف ہو گئے تھے۔ اور 1936 میں ''گئودان'' کے شائع ہوتے ہی ''منگل سوتر'' کے پلاٹ پر دماغ سوزی کرنے لگے تھے۔ مدن گوپال کا متذکرہ بالا بیان درست معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ چار سال کے طویل عرصے کے بعد معاشی اور جسمانی مشکلات میں گھرے ہوئے پریم چند کے دماغ میں کسی ناول کے ''پلاٹ'' کی صلاح محفوظ رہ پانا مشکل تھا۔

نا تمام ناول ''منگل سوتر'' پریم چند نے اپنی بیماری کی حالت میں ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ 16 جون 1936 کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے شورانی دیوی لکھتی ہیں:

''جب ان کے کمرے میں گئی تو مسند کے سہارے ڈیسک پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔'' (پریم چند: گھر میں، صفحہ 337)

25 جولائی 1936 کے واقعات کی تفصیل میں جاتے ہوئے وہ پھر لکھتی ہیں:

''وہ کھانے میں احتیاط کرتے تھے۔ ان کا یہ کرم (سلسلہ) ایک مہینے تک چلتا رہا۔ پر ایک دن بھی وہ نہیں بیٹھے۔ اس میں انھوں نے ''منگل سوتر'' کے کتنے ہی صفحے لکھ ڈالے۔'' (پریم چند: گھر میں، صفحہ 343)

مندرجۂ بالا اقتباسات سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ وسط جون 1936 میں پریم چند ''منگل سوتر'' کی تصنیف شروع کر چکے تھے اور اس کا بیشتر حصہ 25 جون 1936 اور 25 جولائی 1936 کو ہوئی خون کی دو الٹیوں کے درمیان ہی لکھا گیا۔ اس امر کے بھی شواہد موجود ہیں کہ 25 جولائی 1936 کے بعد پریم چند از خود کچھ بھی لکھنے سے معذور ہو گئے تھے مگر اس دوران ''منگل سوتر'' کی تصنیف کا سلسلہ قائم رہنے کی اطلاع مدن گوپال نے ان الفاظ میں دی ہے:

''پانچواں باب انھوں نے بورڈ پر لکھوایا۔ یہ کاغذ کے پُرزوں پر لکھا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں جوڑ کر ان کے سامنے رکھا جائے گا تب وہ اسے ٹھیک ٹھاک کر کے بھیجیں گے۔ لیکن اس سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ ناول کا یہ حصہ پورا نہ ہوسکا۔ ایک ادیب ڈاکٹر من ہر گوپال بھارگو نے لکھا ہے کہ انھوں نے ان کاغذ کے پُرزوں کو دُلارے لال بھارگو کے پاس خود دیکھا تھا۔ اب یہ گم ہوگئے ہیں۔ اس ناول کی اشاعت کے بارے میں شاید خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔''
(کلیاتِ پریم چند، جلد 8، صفحہ xiii)

حالانکہ مدن گوپال نے اپنے بیان کے ثبوت میں کوئی حوالہ پیش نہیں کیا ہے تاہم ان کی اطلاع قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ پریم چند کے اس ناتمام ناول کے کل 4 باب ہی دست یاب ہوتے ہیں اور مدن گوپال کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق پانچواں باب گم ہوگیا۔

''منگل سوتر'': اپورن اپنیاس جو اودھک ترانتم بیماری کے دنوں میں لکھا گیا۔ پرکاشن لیکھک کے دیہانت کے انیک ورش بعد 1948 میں ہوا۔''
(پریم چند: قلم کا سپاہی، صفحہ 656)

ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا درج ذیل اطلاع دیتے ہیں:

''منگل سوتر: ادھورا اپنیاس/ ہنس، فروری 1948، پرشٹھ 325-33 پر پرکاشت۔ پریم اُپہار اور پریم چند اسرتی میں سنکلت۔ ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے پستکا کار روپ میں بھی پرکاشت۔ پرتھم پرکاشن اگیات۔''
(پریم چند وشوکوش، جلد 2، صفحہ 291)

مدن گوپال نے اس ناول کی اشاعت میں ہوئی تاخیر کے متعلق ایک دلچسپ حقیقت بیان کرتے ہوئے رقم کیا ہے:

''منگل سوتر'' ناول میں ہیرو کے بڑے لڑکے کے کردار کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پریم چند کے بڑے لڑکے شری پت رائے نے اس ناول کی اشاعت کی مخالفت کی۔ یہ ناول 1948 تک شائع نہ ہوسکا۔''
(کلیاتِ پریم چند، جلد 8، صفحہ xiii)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ پریم چند ادبیات کے تمام ماہرین اس ناتمام ناول کی پہلی اشاعت 1948 میں ہونے کے متعلق متفق الرائے ہیں۔ حیرت ہے کہ ان حضرات میں سے کسی نے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ پریم چند جیسے مصنف کی آخری تصنیف کا 12 برس تک غیر مطبوعہ رہنا غیر ممکن تھا۔

پریم چند کے قریبی دوست اور ماہنامہ ''زمانہ'' کے شمارے میں ہی ''زمانہ'' کا دسمبر 1936 کا شمارہ پریم چند نمبر کے طور پر شائع کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس خصوصی نمبر کی اشاعت میں نگم صاحب کو بہت سی مشکلات پیش آئیں اور بالآخر زمانہ کا دسمبر 1936 کا یہ پریم چند نمبر فروری 1938 کے اوائل میں منظرِ عام پر آپایا۔ ''زمانہ'' کے اس اہم نمبر کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دلّی نے گوپال کرشن مانک ٹالا کے مقدمے اور ضمیموں کے اضافے کے ساتھ پھر سے شائع کیا ہے جس میں ''پریم چند کی تصانیف'' عنوان کے تحت ''منگل سوتر'' کے متعلق درج ذیل اطلاع درج ہے:

''منگل سوتر: ناتمکل ناول جو سرسوتی پریس سے شائع ہوا۔''
(زمانہ، پریم چند نمبر، صفحہ 309)

فروری 1938 میں منظرِ عام پر آنے والے ''زمانہ'' کے پریم چند نمبر میں ''منگل سوتر'' کا حوالہ دست یاب ہونا اہمیت کا حامل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ پریم چند ادبیات کے کسی بھی محقق نے اس پر توجہ نہیں دی۔ گوپال کرشن مانک ٹالا نے بھی اپنے ضمیمے میں صرف اتنا لکھا ہے:

''منگل سوتر (ناتمکل ناول جو سرسوتی پریس سے شائع ہوا)۔

یہ ناول پریم چند نے بسترِ مرگ پر لکھنا شروع کیا تھا مگر ناتمکل رہ گیا۔ پریم چند کی رحلت کے کافی عرصے بعد ''ہنس'' میں شائع ہوا۔ پھر شری پت رائے نے اسے ''منگل سوتر و انیہ رچنائیں'' میں شائع کیا۔''
(زمانہ، پریم چند نمبر، صفحہ 41)

مانک ٹالا صاحب نے اس حقیقت سے منھ پھیر لیا کہ جس حوالے پر وہ ضمیمہ تحریر کر رہے ہیں وہ 1948 کا نہیں بلکہ دسمبر 1937 یا جنوری 1938 کی تحریر ہے۔ غور طلب ہے کہ ''زمانہ'' پریم چند نمبر میں نگم صاحب نے پریم چند کی تصانیف کی جو فہرستیں پیش کی ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ فہرستیں مکمل نہیں ہیں اور پریم چند کی بہت سی کتابیں ان میں جگہ نہیں پا سکیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دیا نرائن نگم کو پریم چند کی جو کتب دست یاب تھیں وہ فہرستوں میں شامل کر دی گئیں اور جو کتب نہ مل سکیں ان کے نام اور تفصیلات ان فہرستوں میں درج نہ ہو سکے۔

پریم چند اور دیا نرائن نگم کے باہمی تعلقات دوستانہ ہی نہیں بلکہ برادرانہ بھی تھے۔ بسترِ مرگ سے جب پریم چند نے نگم صاحب کو یاد کیا تو وہ کانپور سے بنارس گئے تھے۔ اس وقت دونوں قدیم دوست ہم آغوش ہوئے اور نگاہوں نے زبان کے فرائض انجام دیے۔ ایسی جذباتی حالت میں پریم چند کو اتنی فرصت کیسے مل سکتی تھی کہ نگم صاحب سے اپنے نئے ناول پر کچھ گفتگو کر سکتے۔ اگر یہ تصور بھی کر لیا جائے کہ اس آخری ملاقات میں پریم چند نے ''منگل سوتر'' شروع کرنے کی اطلاع نگم صاحب کو دے دی ہوگی تو بھی محض اس اطلاع کی بنا پر نگم صاحب ''منگل سوتر'' کو مع مکمل تفصیل کے پریم چند کی شائع شدہ کتب میں شامل نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ پریم چند کے کسی بھی خط سے یہ اشارہ نہیں ملتا کہ انھوں نے ''منگل سوتر'' کی تصنیف شروع کر دی تھی۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ جس وقت دیا نرائن نگم نے پریم چند نمبر کے لیے پریم چند کی شائع شدہ کتب کی فہرستیں ترتیب دیں اس وقت ان کے پاس ''منگل سوتر'' کی وہ جلد تھی جو سرسوتی پریس سے شائع ہوئی تھی۔

''منگل سوتر'' کے مسودے کے متعلق دریافت کرنے پر پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے نے گوپال کرشن مانک ٹالا کو اپنے مکتوب مورخہ 8 مارچ 1991 کے ذریعے مطلع کیا:

''منگل سوتر، ہندی میں لکھا گیا تھا۔ منشی جی کے کاغذات میں مجھی کو وہ مسودہ ملا تھا جسے میں نے پھر جیوں کا تیوں اسی نامکمل شکل میں چھاپ دینے کا فیصلہ کیا۔'' (پریم چند: حیاتِ نو، صفحہ 360)

اس کے بعد 8 مئی 1991 کے خط میں امرت رائے نے مانک ٹالا کو مزید اطلاع دیتے ہوئے تحریر کیا:

''پریم چند کے کاغذات میں ایسی ایک تحریر انگریزی میں لکھی ہوئی ملی تھی جس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ''منگل سوتر'' کا تصور ایک ناول کی شکل میں کیا گیا تھا جو بدقسمتی سے نا تمام رہ گیا۔ اگر عمر نے ایک سال ان کے ساتھ وفا کی ہوتی تو وہ ضرور اسے تکمیل پر پہنچا دیتے کیونکہ یہ غالباً مختصر ناول ہونے والا تھا، طویل مختصر افسانہ تو کسی طرح نہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ انگریزی تحریر جس طرح اتفاقاً مجھے مل گئی تھی اسی طرح ان دنوں کے منتشر حالات میں غائب بھی ہوگئی۔ میں نے اسے بہت تلاش کیا مگر بے سود۔''

(پریم چند: حیاتِ نو، صفحہ 361)

امرت رائے کے مندرجہ بالا دونوں مکاتیب سے صاف طور پر واضح ہوجاتا ہے کہ ''منگل سوتر'' کا اصل مسودہ پریم چند کی رحلت کے بعد امرت رائے کو ہی ان کے کاغذات سے حاصل ہوا تھا اور اس کی اشاعت کا فیصلہ بھی امرت رائے کا ہی تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ خصوصی طور پر احتیاط برتتے ہوئے امرت رائے نے اس ناول کی پہلی اشاعت کے متعلق کوئی اشارہ تک نہ کیا۔ اگر اس ناول کی پہلی اشاعت ماہنامہ ''ہنس'' کے فروری 1948 کے شمارے میں ہوئی ہوتی تو کیا وجہ تھی کہ امرت رائے نے اس حقیقت کو مانک ٹالا سے پوشیدہ رکھا۔ وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ اس ناول کی پہلی اشاعت فروری 1938 سے قبل ہوچکی تھی جسے امرت رائے کسی خاص سبب سے ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے۔

اس طرح اس نا تمام ناول کی پہلی اشاعت کا جو قصہ سامنے آتا ہے، قیاساً اس کی کڑیاں یوں ملتی ہیں:

منشی پریم چند کی رحلت کے بعد ان کی وراثت ان کے دونوں فرزندوں شری پت رائے اور امرت رائے کو ملی اور اسی ورثے میں دیگر جائداد کے علاوہ سرسوتی پریس اور پریم چند کے تمام کاغذات بھی انھی کو ملے۔ شری پت رائے کی کوئی دلچسپی پریم چند کے کاغذات میں نہ تھی۔ اس کے برعکس امرت رائے کی دلچسپی پریم چند کے کاغذات اور تخلیقات میں تو تھی ہی، انھیں وراثت میں تصنیف کی صلاحیت بھی حاصل ہوئی۔ پریم چند کے کاغذات میں امرت رائے کو جیسے ہی ان کے آخری نا تمام ناول کا مسودہ ملا انھوں نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے سرسوتی پریس سے کتابی صورت میں اسے شائع کرادیا اور اس کی ایک کاپی پریم چند کے قریب ترین دوست دیا نرائن نگم کو ارسال کردی۔ شری پت رائے کے ہاتھ میں ''منگل سوتر'' کی شائع شدہ جلد جیسے ہی آئی انھوں نے اسے پڑھ ڈالا اور ناول کے ہیرو کے بڑے بیٹے کے کردار کی عکاسی دیکھ کر انھیں ایسا محسوس ہوا گویا پریم چند کا قلم انھی کے کردار کی عکاسی کررہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس ناول کی اشاعت کی سخت مخالفت کی جس کے سبب دونوں بھائیوں میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ غالباً چند قریبی احباب و اعزا کے بیچ بچاؤ کرنے پر دونوں بھائی اس بات پر راضی ہوئے کہ ''منگل سوتر'' کی شائع شدہ تمام جلدیں نذرِ آتش کردی جائیں اور پریم چند کی اس آخری تخلیق کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فراموش کردیا جائے۔ مگر جو جلد دیا نرائن نگم کو ارسال کردی گئی تھی اس کا امرت رائے کو خیال نہ رہا اور وہ جلد نگم صاحب کے پاس محفوظ رہی جس کا ذکر انھوں نے فروری 1938 میں چھپ کر تیار ہوئے ''زمانہ'' کے پریم چند نمبر میں کردیا۔

دس گیارہ برس تک امرت رائے کے دل میں یہ کسک بنی رہی کہ ان کے بڑے بھائی کی پُر زور مخالفت کی وجہ سے ان کے والدِ مرحوم کا آخری نا تمام ناول ادبی دنیا کے سامنے نہ آسکا۔ غور طلب ہے کہ اس درمیان دونوں بھائی مشترکہ طور پر سرسوتی سے ''منگل سوتر'' کو بنا شری پت رائے سے مشورہ کیے ماہنامہ ''ہنس'' کے فروری 1948 کے شمارے میں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان پبلشنگ ہاؤس الٰہ آباد سے کتابی صورت میں بھی شائع کرادیا۔

شری پت رائے پھر بپھرائے لیکن ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس کے زیرِ اہتمام کتابی صورت میں شائع ہونے کے بعد یہ ممکن نہ رہ گیا تھا کہ ''منگل سوتر'' کی تمام شائع شدہ جلدیں دوبارہ نذرِ آتش کردی جائیں کیونکہ ناشر گھر سے باہر کا شخص تھا۔ لہٰذا دونوں بھائیوں میں مزید اختلافات پیدا ہوئے اور بات یہاں تک بڑھی کہ دونوں بھائیوں کا ساجھے داری میں کاروبار کرنا اور پریس چلانا بھی ناممکن ہوگیا۔ دس ماہ کے سخت اختلافات کے بعد دونوں بھائی علاحدہ ہوگئے۔ ''سرسوتی پریس'' شری پت رائے کے حصے میں چلا گیا اور امرت رائے نے الٰہ آباد میں ''ہنس پرکاشن'' کے نام سے اپنا الگ ادارہ قائم کرلیا۔ ہنس پرکاشن سے شائع شدہ کتب کی فہرست پر صاف الفاظ میں درج ہے کہ یہ ادارہ 1949 میں

وجود میں آیا، جس سے مندرجہ بالا قصے کی تصدیق ہوتی ہے۔

اُدھر جب شری پت رائے نے یہ دیکھا کہ ''منگل سوتر'' کی ادبی حلقوں میں بھاری مانگ ہے تو ان کے ذاتی خیالات پر ان کا کاروباری ذہن حاوی ہوگیا۔ نتیجتاً شری پت رائے نے ''منگل سوتر وانیہ رچنائیں'' میں شامل کرکے ''منگل سوتر'' کو شائع کردیا۔ اس کی تمہید میں انھوں نے تحریر کیا تھا:

''لیکھک اس اپنیاس کو اپنے جیون درشن کا پرتیک مان کر چلا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کی سمپورن پریکلپنا ان کے اپنے جیون پر آدھارت تھی۔ کئیں ارتھوں میں آپ اسے ایک آتم کتھاتمک اپنیاس مان سکتے ہیں۔''

(منگل سوتر وانیہ رچنائیں، صفحہ 204)

ابتدا میں شری پت رائے نے ''منگل سوتر'' کی اشاعت کی کتنی بھی مخالفت کی ہو، اسے شائع کرکے انھوں نے ایک ہی تیر سے دو شکار کرے۔ اولاً یہ کہ اس کی اشاعت کے ذریعے اپنی مخالفت کا زور کم کردیا دوسرے اس کے ذریعے بھاری منافع وصول کیا۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی رُو سے ''منگل سوتر'' کا زمانۂ اشاعت فروری 1938 سے قبل معین ہوتا ہے۔ لیکن اس کے متعلق وثوق کے ساتھ تب تک کچھ کہنا مشکل ہے جب تک شری پت رائے یا امرت رائے کا کوئی از حد قریبی دوست دونوں بھائیوں کے باہمی اختلافات اور سرسوتی پریس سے علاحدہ ہوکر امرت رائے کے ہنس پرکاشن قائم کرنے کی وجوہات پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالتا اور جب تک سرسوتی پریس سے شائع شدہ ''منگل سوتر'' کی وہ جلد سامنے نہیں آتی جس کی بنا پر منشی دیا نرائن نگم نے ''زمانہ'' کے پریم چند نمبر میں اس کی اشاعت کا واضح طور پر حوالہ دیا ہے۔

□□□

پتہ:

46-B, New Mandi, Muzaffarnagar-251001

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس/ مترجم: ایس. ایم. احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیِ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جدوجہدِ آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/25 روپے

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا پادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والوں میں مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل سرِفہرست ہیں۔ یہ آپ بیتی انھوں نے گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی سے دو دن پہلے مکمل کی تھی۔ جدوجہد آزادی کے اس دور کی حقیقی تصویر کشی کے سبب یہ آپ بیتی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مہتاب عالم

ایوانِ غزل کا ستون ــــ فراق گورکھپوری

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلوگے مگر پا نہ سکوگے

اردو شاعری کے افق پر شاعروں کی جو کہکشاں روشن ہے اس میں ولی، میر، غالب، داغ، درد، آتش، مومن، حسرت، اصغر، فانی، جگر اور یگانہ کے ناموں کے ساتھ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا نام بھی شامل ہے۔ فراق بیسویں صدی کے نہ صرف ایک اہم شاعر ہیں بلکہ انھیں اس دور میں آبروئے غزل بھی کہا جاسکتا ہے۔

فراق گورکھپوری کی پیدائش 28 اگست 1896 کو بروز جمعہ لکشمی بھون گورکھپور میں ہوئی۔ وہ گورکھ پرشاد عبرت گورکھپوری کے صاحبزادے تھے جو ایک خوش فکر شاعر تھے اور مثنوی ''حسنِ فطرت'' کے مصنف۔ فراق کا آبائی وطن بنوار پار تحصیل بانس گاؤں، ضلع گورکھپور تھا۔ ابتدائی تعلیم اردو فارسی کی گھر پر ہی ہوئی۔ پھر ماڈل اسکول اور مشن اسکول گورکھپور میں زیرِ تعلیم رہنے کے بعد گورنمنٹ جوبلی اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے 1913 میں مڈل اسکول پاس کیا اور ایف. اے. کی تعلیم کے لیے الٰہ آباد چلے گئے۔ 1918 میں سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوئے مگر ملازمت نہیں کی اور جواہر لعل نہرو کے زیرِ اثر قومی تحریک میں شامل ہوگئے۔ سال بھر جیل میں بھی رہے۔ رہائی کے بعد کانگریس کمیٹی کے انڈر سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ جواہر لعل نہرو کے یورپ روانہ ہونے پر پہلے کرسچن کالج لکھنؤ اور پھر سناتن دھرم کالج کانپور میں استاد کی حیثیت سے فراق کا تقرر ہوا۔ 1930 میں انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم. اے. کیا اور اسی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں استاد مقرر ہوئے۔ 1958 میں وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ فراق کا انتقال 1982 میں دہلی میں ہوا۔

فراق کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ انھوں نے اپنا شعری سفر 1918 کے آس پاس شروع کیا۔ ابتدائی دور میں امیر مینائی کے شاگرد وسیم خیرآبادی سے اصلاح لیتے تھے لیکن جلد ہی اپنا جداگانہ اسلوب اختیار کرلیا۔ فراق نے غزل، روحِ کائنات، شبنمستان، غزلستان، گلِ نغمہ، پچھلی رات، روپ، اور تنقیدی تحریروں میں اندازے، اردو کی عشقیہ شاعری، اور مکاتیب کا مجموعہ من آنم شامل ہیں۔

بقول خواجہ احمد فاروقی بہ حیثیت غزل گو فراق کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے احساسِ جمال کو حیات اور کائنات کو سمجھنے کے لیے بطور قدر استعمال کیا ہے اور اپنے جذبے اور فکر میں ڈوبے ہوئے نغموں کو ایسے آتشیں احساس کے ساتھ گایا ہے کہ شعلہ سا لپک جائے ہے اور ہم تھوڑی دیر کے لیے نئی آگاہیوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ فراق کی شاعری میں ہندوستانی اور آفاقی کلچر اس طرح شیر و شکر ہوگئے ہیں کہ غزل کی دوشیزگی نکھر آئی ہے۔ فراق انگریزی کے معلم تھے اور انھوں نے انگریزی کی رومانی شاعری کے ساتھ اردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری سے بھی فیض اٹھایا ہے نیز تلسی، سورداس، کالی داس اور جے دیو کے خرمن سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ سنسکرت ادبیات نیز ہندو دیومالا سے ان کے گہرے لگاؤ نے جہاں ان کے جمالیاتی احساس کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں میں ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے وہیں یہ لگاؤ ان ذہن کو ایک روحانی مہک سے بھی مانوس و مربوط کرنے کا باعث ہوا۔ فراق کا تصورِ عشق تہہ داری لیے ہوئے ہے اور اس کی حدیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس تصور میں جمود نہیں بلکہ ہمکتے ہوئے دھاروں کی روانی ہے۔ انھوں نے عشق کو محبوب کے حریمِ ناز تک محدود رکھنے کے بجائے کائنات کی پہنائیوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان کا عشق قیس و کوہکن سے زیادہ دورِ حاضر کے عام آدمی کا عشق ہے مگر ان کی نفسیاتی سطح میں عمومیت نہیں، انفرادیت ہے۔ سربلندی اور خاکساری کا اشتراک ان کے عشق میں ایک نئی کیفیت کی تخلیق کرتا ہے جو چاہنے اور چاہے جانے کے جذبات کو بیدار اور توانا کرتی ہے۔ یہی بیداری اور توانائی فراق کی غزل کو حیات و کائنات کے قریب لاتی ہے اور انسان کے کرب و انبساط، سکون و اضطراب کا آئینہ بناتی ہے۔ وہ ایک معنی میں زندگی کو غزل اور غزل کو زندگی بنا دیتے ہیں جو بہت اہم اور انوکھی بات ہے۔ فراق کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے زندگی کے ہر پہلو کی نمائندگی ہوتی ہے:

ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کھول رہی ہے
ہاں! دھیان سے سننا، یہ صدی بول رہی ہے

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

ایک تصویر تھی وصال کی رات
آپ کے لطفِ انتہائی کی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو، اس کی رہگزر آئی

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے

رونے کو تو زندگی پڑی ہے
کچھ تیرے ستم پہ مسکرا لیں

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

فراق بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ جدید غزل کے امام بھی کہے جاتے ہیں لیکن انھوں نے رباعی کی وادی میں بھی نئی راہیں نکالی ہیں جن میں ہندوستانی سماج کے چراغ جل رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نظم گوئی کی طرف بھی فراق نے توجہ کی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں مختلف موضوعات کو جگہ دی ہے۔ مثلاً انھوں نے سیاسی، عشقیہ، تاریخی اور سوانحی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ فراق نے نظمیں کم کہی ہیں لیکن جو نظمیں کہی ہیں ان کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ ''آدھی رات'' فراق کی ایک اہم نظم ہے۔ اس نظم کا تعلق دوسری جنگ عظیم کے زمانے سے ہے۔ اس نظم میں فراق نے دوسری جنگ عظیم کی ان ہولناکیوں کی جھلک پیش کی ہے، جب روس کی فوج برلن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس نظم میں جرمنی اور روس کی جنگ کی تفصیلات تو نہیں ہیں لیکن جنگ کے تاثرات موجود ہیں۔ فراق نے نظام سیاست کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا نظام جاگیرداری، دوسرا نظام سرمایہ داری اور تیسرا نظام اشتراکیت۔ اس نظم میں فراق نے سامراجیت اور سرمایہ داری کی مخالفت اور اشتراکیت کی حمایت کی ہے۔ اسی طرح ایک دوسری نظم ''دھرتی کی کروٹ'' میں فراق نے زمانے کے نئے انقلاب، امیر و غریب کے فرق کے باطل ہونے اور مساوات کے پرچم کی بالادستی کی بات کہی ہے۔ ایک اور نظم ''کسانوں کی پکار'' میں فراق نے کسانوں کی کسمپرسی اور زمینداروں کے ظلم و ستم کو پیش کیا ہے ساتھ ہی ایک نئی دنیا کی تمنا کی ہے۔ فراق اشتراکیت سے متاثر رہے ہیں مگر اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں میں باقاعدہ حصہ کبھی نہیں لیا۔ ''دھرتی کی کروٹ'' فراق کی اہم نظم ہے مگر اس کا اسلوب بہت سپاٹ اور بے کیف ہے۔ فراق نے ''ہاں اے دل افسردہ'' کے عنوان سے بھی ایک نظم کہی ہے، اس نظم کی بحر وہی ہے جو خاقانی نے مدائن کے قصیدہ کے لیے اختیار کی تھی۔ پوری نظم میں شاعر پر ایک افسردگی سی طاری ہے۔ مختلف واقعات، حالات اور سانحات نے اسے غمگین بنا دیا ہے۔ مگر اس افسردگی میں بھی فراق ایک فلسفیانہ انداز میں خود کو تسکین دیتے ہیں۔ نظم ''جگنو'' میں بھی غم کی عکاسی کی گئی ہے۔ ایک اور نظم ''تلاش حیات'' جو 1948 کے سال نو کے موقعے پر لکھی گئی ہے، اس نظم میں اہل ہند کو آزادی کے بعد کی نئی ذمے داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

فراق گورکھپوری نے منظریہ شاعری بھی کی ہے۔ اگرچہ منظر نگاری ان کا خاص موضوع نہیں ہے اور منظر نگاری میں انھیں وہ کمال بھی حاصل نہیں ہے جو مثلاً ان کے ہمعصر جوش ملیح آبادی کو حاصل ہے۔ تاہم ان کے یہاں منظر نگاری کی مثالیں جابجا ملتی ہیں۔ اس حوالے سے ''ترانۂ خزاں'' ایک دلکش نظم ہے، جس میں فراق نے فطرت کا براہ راست بیان پیش کیا ہے جب کہ اپنی بہت سی نظموں میں فراق نے فطرت کو بطور پس منظر پیش کیا ہے جیسے ان کی نظم ''پرچھائیاں''۔ یہ ایک عشقیہ نظم ہے مگر عشق کے تصور کو مزید معنی خیز اور پر اثر بنانے کے لیے فراق نے مناظر قدرت کی عکاسی کی ہے۔ فراق نے ''داستانِ آدم'' کے عنوان سے ایک تاریخی نظم بھی کہی ہے جس میں انسان کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''ہنڈولہ'' کو فراق کی سوانحی نظم کہا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں فراق نے اپنے بچپن اور جوانی کے حالات اور جذبات کی عکاسی کی ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے ہم فراق کی زندگی کے اندر جھانک کر دیکھ سکتے ہیں اور ان کی شاعری کو نزدیک سے سمجھ بھی سکتے ہیں۔

فراق کی رباعیاں بھی توجہ طلب ہیں حالانکہ رباعی کی جانب وہ بہت بعد میں متوجہ ہوئے ہیں۔ اپنی تخلیق ''روپ'' سے پہلے وہ کبھی باقاعدہ رباعی کہنے کی جانب متوجہ نہیں ہوئے لیکن جوش ملیح آبادی سے دہلی میں ایک تکرار کے بعد جب ان کی پہلی رباعی وجود میں آئی تو پھر خیالات کا یہ سلسلہ رو کے نہ رکا، اور صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں ساڑھے تین سو رباعیات انھوں نے کہہ لیں۔ فراق کی رباعیاں ''شرنگار رس'' کی آئینہ دار ہیں۔ ''روپ'' کی تمام رباعیاں جمالیاتی ذوق کی تسکین کا خزانہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان رباعیات کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ صرف چند کو چھوڑ کر ہر رباعی ایک نادر تشبیہ کا نمونہ ہے۔ فراق اور جوش کے درمیان دہلی میں ہوئی تکرار کے بعد دنیائے ادب کو یہ اندیشہ لاحق ہوگیا تھا کہ ان دوستوں کے بیچ محبت کا رشتہ دوبارہ استوار نہ ہوسکے گا لیکن فراق نے اپنی رباعیات کے مجموعے کا انتساب جوش کے نام کر کے دوستی کی ایک نظیر قائم کردی۔ جوش سے تکرار کے بعد فراق کو کتنی تکلیف ہوئی اس کا اظہار خود فراق نے ''روپ'' میں اس طرح کیا ہے:

معصوم خلوصِ باطنی کچھ بھی نہیں
وہ قرب وہ قدرِ باہمی کچھ بھی نہیں
اک رات کی وہ جھڑپ وہ جھک جھک سب کچھ
اور آٹھ برس کی دوستی کچھ بھی نہیں

الغرض فراق ہمارے عہد کے شاعروں کی اس کہکشاں کا حصہ ہیں جس سے ہمارا آسمانِ شعر و ادب روشن ہے۔ زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ تو سبھی فنکار کرتے ہیں اور اس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر مستفید بھی ہوتے ہیں مگر فراق نے اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار جس خوبی سے کیا ہے اس سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہ امتیاز انھیں ان کے منفرد شعری آہنگ نے بخشا ہے۔ اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس خود فراق کو بھی تھا ورنہ وہ اس شاعرانہ تعلّی کا اظہار نہ کرتے:

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا ان کو، تم نے فراق کو دیکھا ہے

□□□

پتہ:
Plot No. 81, Zone-2, M.P. Nagar, Bhopal, (M.P.)

محمد اختر

فضا ابن فیضی

فضا ابن فیضی مشرقی تہذیب و ثقافت کے پاسدار اور ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ ان کا تعلق ایک دینی اور علمی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد ایک باعمل عالم دین تھے اور دادا مولانا ابوالمعالی فیضی اپنے زمانے کے چند صاحب کمال اہل علم میں سے ایک تھے۔ انھیں اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ علم حدیث اور تفسیر، ان کے خاص موضوع تھے۔ فضا ابن فیضی نے عرب شعرا کی تقلید کرتے ہوئے والد کے بجائے جدامجد کی طرف ابنیت کی نسبت کی اور فضا ابن فیضی کے نام سے مشہور ہوئے، جب کہ ان کا اصلی نام فیض الحسن اور والد محترم کا اسم گرامی منظور حسن تھا۔ ان کی پیدائش مئوناتھ بھنجن کے محلہ جمال پورہ میں یکم جولائی 1923 کو ہوئی اور بروز سنیچر 17 جنوری 2009 کو اس دار فانی کو الوداع کہا۔

فضا ابن فیضی کی تعلیم و تربیت دینی اور علمی ماحول میں ہوئی، مدرسۂ عالیہ عربیہ (جو مئوناتھ بھنجن کا ایک مشہور دینی ادارہ ہے) سے عربی چہارم تک تعلیم حاصل کی اور مزید تعلیم کے لیے جامعہ فیضِ عام (یہ بھی مئوناتھ بھنجن کا ایک قدیم اور مشہور دینی ادارہ ہے) میں داخلہ لیا۔

1942 میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد فضا ابن فیضی نے مشرقی تہذیب و ثقافت کی پاسداری کو اپنا خاص وظیرہ ٹھہرایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اصلاحی رجحان غالب ہے۔ ان کے خاندان اور فکری رجحان کے بارے میں پروفیسر قمر جہاں کی رائے بڑی حد تک جامع ہے، وہ لکھتی ہیں:

"فضا ابن فیضی کا تعلق ایک مستعلیق گھرانے سے ہے اور یہی تہذیبی فضا اور مستعلیقیت ان کی شاعری میں جاری و ساری ہے۔ خصوصاً نظم نگاری میں ان کا اصلاحی رجحان اور فکری عنصری انھیں ایک ممتاز درجے پر فائز کرتا ہے۔ غزل میں وہ جہاں کلاسیکی رجحان کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں، وہیں نظم نگاری میں جدت خیال اور ندرت فکر کی باریکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں:

"فکر کی روکسی تحریک کی پابند نہیں۔ سچے شاعر ہو تو ذہنوں کو کشادہ کرلو، یہی سچائی ایک اچھے شاعر کا سرمایۂ حیات ہے، اقتدار کی ہوس میں گرفتار طبقے کا غریب عوام سے تصادم ایک ایسا موضوع ہے جو تمام انسانی تاریخ کو محیط ہے۔ مسائل حیات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرأت، مذموم سیاست کے گھناؤنے چہرے کو بے نقاب کرنا اور زندگی کے تلخ حقائق کو اپنے فن کی بنیاد بنانا ایک سچے شاعر کا منصب ہے اور فضا ابن فیضی صحیح معنوں میں اس منصب سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔"

پروفیسر قمر جہاں کی مذکورہ بالا رائے سے فضا ابن فیضی کی شاعری کے موضوعات بڑی حد تک واضح ہوجاتے ہیں۔ درحقیقت انھوں نے مسائل حیات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے اور اپنے حقیقی جذبات و احساسات کو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا ہے اور اس طریقے سے کہ مشرقی تہذیب و ثقافت پر آنچ نہ آنے پائے۔

فضا ابن فیضی کی شاعری کا ابتدائی دور بڑی حد تک نظم نگاری پر مشتمل ہے، یہ 1934 کا زمانہ تھا۔ جو سیاسی و سماجی اعتبار سے کافی انتشار و اختلاف کا زمانہ ہے۔ اس پر آشوب دور میں فضا ابن فیضی نے نظم نگاری کی طرف خاص توجہ دی، ساتھ ہی ساتھ غزل، رباعی اور حمد و نعت جیسی اصناف کو بھی اپنی شاعری کا محبوب موضوع قرار دیا لیکن اگر ان کی پوری شاعری پر ایک نظر ڈالی جائے تو کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے غزلیہ شاعری کا پلہ بھاری نظر آئے گا۔

فضا ابن فیضی ایک باشعور اور حساس انسان تھے۔ ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ ملک کی آزادی اور تقسیم اور پھر تقسیم کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات، انتشار و اختلاف، اضطراب و بے چینی اور لسانی تعصب جیسے بے شمار مسائل کا در آنا، ان پیچیدہ اور حساس مسائل و معاملات نے اس حساس شاعر کے دن کا سکون اور رات کی نیند چھین لی۔ تقسیم ملک کے بعد فضا ابن فیضی کو جو شے سب سے زیادہ پریشان کررہی تھی وہ اہل سیاست کا دورخاپن اور مکر و فریب تھا۔ یہ ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ ان کی ایک مشہور نظم "شجر نور" ہے۔ اس نظم کے چند اشعار سے فضا ابن فیضی کے درد و کرب کو سمجھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے اس سے کتنے دکھی تھے اس کا بخوبی اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:

وہی جنوں، وہی نفرت، وہی دل آزاری
وہی زبان کا تعصب، وہی دلوں کا فساد
وہی مناصب و اعزاز و اقتدار کی بھوک
وہی امیری و شاہی و منعمی کا فسوس
وہی سماج کی پستی، معاشرے کی گھٹن
قدم قدم پہ وہی نابرابری کے اصول

ملک کی تقسیم کے بعد فتنہ فساد کا سلسلہ شروع ہوا۔ بے گناہ لوگوں کا خون

بہایا گیا، لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے، فضا ابن فیضی نے ان تمام افراد کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو اس صورت حال کے اصل ذمے دار تھے۔ فضا ابن فیضی کی نظم 'صلیبوں کا شہر' اس کی عمدہ مثال ہے:

ہمارے ساتھ صلیبوں کے شہر تک آؤ
نباتِ ونوش کے لذت کدوں کے دیوانو!
کبھی تو کارگہہ نیش و زہر تک آؤ
تمھیں دکھائیں
جو انسانیت کے مظہر تھے
خود اپنے ہاتھ لہو میں ڈبوئے بیٹھے ہیں
تمھیں دکھائیں
کہ جو لوگ شمع محفل تھے
نظر میں اپنی اندھیرے سموئے بیٹھے ہیں
ہمارے ساتھ صلیبوں کے شہر تک آؤ
تمھیں دکھائیں
جو انسانیت کے مظہر تھے
جو زندگی کے محافظ تھے، خلق پرور تھے
رگِ حیات میں خنجر چبھوئے بیٹھے ہیں
خود اپنے ہاتھ لہو میں ڈبوئے بیٹھے ہیں

ہمارا ملک ہندوستان جن چند اہم مسائل سے دوچار ہے، ان میں ایک قومی یکجہتی کی کمی بھی ہے۔ ملک چند شر پسند عناصر کی وجہ سے فرقوں، جماعتوں اور صوبوں میں بٹتا نظر آ رہا ہے، ہنگامے اور فتنہ و فساد بڑھتے جا رہے ہیں۔ کہیں زبان کے نام پر تو کہیں علاقائیت کے نام پر۔ دوسری طرف ملک کی سالمیت کے لیے فرقہ پرست جماعتیں اور تنظیمیں خطرہ بنتی جا رہی ہیں۔ ان حالات میں قومی یکجہتی کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ یہ عوام میں ایک دوسرے کے تئیں ہمدردی، احترام اور ایثار کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ فضا ابن فیضی نے اپنی شاعری کے ذریعے محبت کا پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ اور قومی یکجہتی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے والے کون لوگ ہیں؟ اس موضوع پر ان کی نظم ''فریب مسیحائی'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ دلفریب و حسیں اصطلاحوں کے پیکر
خود اپنی معنویت کی چتا میں جلتے ہیں
برہنہ پھرتی ہے قول و عمل کی سچائی
ہوس کی گد میں خوش پوش، جھوٹ پلتے ہیں
سیاسی مصلحتوں کی صلیب اٹھائے ہوئے
خود آفتاب بھی سائے کے پیچھے چلتے ہیں
کہاں ہو عظمت فکر و نظر کے دیوانو!
کہاں ہو دانش و تہذیب کے فسانہ گرو!
کہاں ہو آشتی و زندگی کے معمارو!
ذرا دریچۂ حالات کے حسیں چلمن
اٹھا کے تم بھی یہ تصویر روز و شب دیکھو!
لہولہان کھڑے ہیں وہ اپنے شہر میں لوگ
نظر میں سلگی ہوئی حسرتیں بسائے ہوئے
بدن پہ زخم، جبیں پر لہو سجائے ہوئے

فضا ابن فیضی کی عوام دوستی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''سراغ زندگی ڈھونڈنا اور پانا ایک اچھے اور سچے فن کار کے لیے ضروری ہے اور اس دنیا میں کسی نہ کسی قدر کے ساتھ وابستگی اور وفاداری ضروری ہے۔ ہمارے نئے شاعر عام طور سے اس ذمے داری سے گریزاں ہیں، چنانچہ کشمکش زندگی سے یہ گریز ہی ہے، جو ان کی شکست اور اس سے پیدا ہونے والے احساس بے چارگی، بے بسی، اداسی اور پھر ان کے فن کی بے سمتی اور بے چہرگی کا باعث ہے۔ فضا ابن فیضی فرار کی اس کیفیت میں مبتلا نہیں ہیں۔ ان کا ذہن حقائق کا انکار نہیں، اقرار کرتا ہے۔ وہ انسانیت کے ''درد و داغ و جستجو و آرزو'' میں شرکت کا حوصلہ دکھاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انبساط و نشاط اور شرح و بسط کا سرچشمہ یہی سراغ زندگی ہے۔''

حیات و ممات کے حقائق سے وابستگی فضا ابن فیضی کی شاعری کا نمایاں وصف ہے جو ہمیں زمینی سچائی سے قریب کرتی ہے، انسانی مسائل سے آگہی بخشتی ہے، دکھ درد کا مداوا بن کر سامنے آتی ہے اور زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کا ہنر بھی سکھاتی ہے۔

تخریب کاری نے انسانیت کے چہرے کو جس طرح مسخ کر دیا ہے سچا اور اچھا فن کار اس کیفیت کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں اسے بیان بھی کرتا ہے۔ انسانی اقدار کو پامال کرنے والے، فضا ابن فیضی کی نظم ''وادیٔ آشوب'' کا موضوع بنے ہیں:

کتنے آئینوں کا ایمان سیہ کاری ہے
کتنے اصحاب بصیرت پہ جنوں طاری ہے
کتنے فرعون ہیں پہنے ہوئے موسیٰ کا لباس
کتنے ناسور ہیں خود اپنے ہی مرہم سے نراس
وارث مسجد نبوی ہیں ابھی کتنے یہود
مول بکتے ہیں ابھی کتنے معابد میں ثمود

کھا گئے اپنے برہمن ہی کو کتنے زنار
خون عیسیٰ سے ہیں یاں کتنی صلیبیں گلنار

اس طرح کے رویے اور طریقۂ عمل سے شاعر کی روح بے چین اور پریشان ہے۔ اس بے چینی اور پریشانی کو فضا ابن فیضی نے ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ اصحاب ذوق دادو تحسین دیے بغیر نہیں رہ پاتے۔

فضا ابن فیضی ایسے شاعر تھے جو حقائق پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فضا ابن فیضی کے متعدد شعری مجموعے اشاعت پذیر ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے:

1. سفینۂ زرگل (غزلیات و رباعیات) 1973
2. شعلۂ نیم سوز (منظومات) 1978
3. دریچۂ سیم سمن (غزلیات) 1989
4. سرشاخ طوبیٰ (حمد و نعت و منظومات) 1990
5. پس دیوار حرف (غزلیات) 1991
6. سبزۂ معنی بیگانہ (غزلیات) 1994
7. غزال مشک گزیدہ (رباعیات) (زیر ترتیب تھا)
8. لوح آشوب آگہی (منظومات) (زیر ترتیب تھا)
9. آئینۂ نقش صدا (غزلیات) (زیر ترتیب تھا)

ان مجموعوں کے مطالعے سے فضا ابن فیضی کے فکر وفن کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے اور معاصر شعری منظرنامے میں بحیثیت شاعر ان کے مقام و مرتبے کا تعین بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری میں تہذیب و ثقافت، عصری زندگی کے مسائل اور اخلاقی اقدار کی پیشکش فنکارانہ انداز میں ہوئی ہے۔ اس طرح کہ فنی جلال و جمال پر حرف نہ آئے۔

فضا ابن فیضی کا ذوق جمال اور احساس حسن تجرباتی و مشاہداتی ہے۔ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں دونوں میں سلاست، روانی، ترنم اور شگفتگی موجود ہے۔ عربی و فارسی کے دقیق الفاظ استعمال کرنے کے باوجود فضا ابن فیضی کی شاعری ثقالت سے محفوظ ہے، ان کا لب ولہجہ باوقار، سنجیدہ اور متین ہے۔

فضا ابن فیضی کی شاعری کا اگر مجموعی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو غزلیہ شاعری کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ لیکن ان کی غزلیں بعض دوسرے غزل گوشعرا کی طرح نہ تو داستان حسن وعشق ہیں نہ ہی افسانۂ رنج والم، بلکہ ان میں ساز حیات بھی ہے اور سوز حیات بھی اور مشکلات و مصائب سے نبرد آزما ہونے کا درس بھی:

زندگی کے دشت میں سایہ نہ ڈھونڈ
چلنے والے آگ کے اوپر چلے

کسی بھی شاعر و ادیب کی تخلیقات اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ فضا ابن فیضی کی تخلیقات سے ابھرنے والی شخصیت نہ تو کسی رومانی شاعر کی ہے اور نہ انقلابی شاعر کی۔ وہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے جھمیلے سے بھی بڑی حد تک دور رہے کیوں کہ سچا فنکار اپنے فن میں ہی جیتا اور مرتا ہے، وہ اپنی تمام سانسیں اسی کے لیے وقف کر دیتا ہے، یہی معاملہ فضا ابن فیضی کا بھی رہا ہے۔ وہ ایک سچے فنکار تھے اور ان کا شعری کارنامہ قابل قدر ہے۔

□□□

پتہ:
Vasant College for Womens,
Raj Ghat Fort,
Banaras, U.P.

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد، تصوف کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالات زندگی، ان کی تصانیف اور شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے یہ ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت -/14 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

نشاں زیدی

تانیثیت کی بنیاد گزار — محمدی بیگم

عورت کے مکمل انسانی وجود کی نفی کی وجہ سے بغاوت کی ایک لہر پیدا ہوگئی ہے اور مرد اساس نظام کے خلاف احتجاج کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ عہد عتیق میں دیوتاؤں کی حیثیت ثانوی اور دیویوں کی حیثیت اولین تھی۔ ماہرین آثار قدیمہ نے بھی جو مجسمے دریافت کیے ہیں ان میں قدیم ترین مجسمہ عورت کا ہی ہے۔ بابل میں عشتار دیوی، سمریہ میں اناتا، مصر میں Isis، روم میں Cebele کی پرستش کا رواج تھا۔ موجودہ دور کی تحریک نسواں کو اس روایت سے جوڑ کر دیکھا جائے تو یہ گمشدہ یا سلب کردہ حقوق کی بازیابی کی ایک جنگ ہے۔

عورت ایک خود مختار، زندہ، توانا وجود ہے نہ کہ جنسی معروض۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین غیر منطقی صنفی امتیاز کے خلاف آواز بلند کر رہی ہیں۔ عورت کا دائرۂ کار صرف گھر تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا عمل دخل ہے۔ بعض معاشرتی تحدیدات کی وجہ سے خواتین اب تک خاموش رہیں مگر موجودہ عہد میں اس خاموشی کو زبان مل گئی ہے یہ سلسلہ رشیدۃ النسا کے ناول ''اصلاح النسا'' سے شروع ہوا۔ بچوں کی تعلیم، تعلیم نسواں، امور خانہ داری اور معاشرے کے رسم و رواج کو پیش نظر رکھتے ہوئے نادر جہاں کا ناول ''افسانۂ نادر جہاں یا فسانۂ طاہرہ'' منظر عام پر آیا۔ ان ناولوں سے متاثر ہو کر تحریک نسواں کو فروغ تو حاصل ہوا لیکن خواتین کی تخلیقات کو منظر عام پر لانے اور خواتین کو تخلیق کی طرف راغب کرنے میں محمدی بیگم نے اہم رول ادا کیا۔ محمدی بیگم نے 1898 میں لاہور سے ہفتہ وار اخبار ''تہذیب نسواں'' خواتین کے لیے جاری کیا۔ اس اخبار نے عورتوں میں لکھنے کی صلاحیت پیدا کی۔

بقول قرۃ العین حیدر: ''یکم جولائی 1898 ایک اہم تاریخ ہے۔ اس روز لاہور سے شمس العلما مولوی سید ممتاز علی نے زنانہ ہفتہ وار اخبار ''تہذیب نسواں'' جاری کیا۔ ان کی بیوی محمدی بیگم (والدہ سید امتیاز علی تاج) نے اخبار کی ادارت سنبھالی۔ بہت جلد ''تہذیب نسواں'' سارے ہندوستان کے متوسط طبقے کے اردو داں مسلم گھرانوں میں پہنچنے لگا۔ اس کی وجہ سے معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشین خواتین میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے دیکھتے انھوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ناول لکھنا شروع کر دیے جو تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے آج ستر برس بعد لکھے جانے والے بیشتر ناولوں سے کسی طرح کم نہیں۔''

(کار جہاں دراز ہے)

یہ وہ دور تھا جب عورتوں کا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے تاریک دور میں کسی عورت کا اس سمت قدم اٹھانا ایک انقلابی کام تھا۔ ''تہذیب نسواں'' میں محمدی بیگم نے عورتوں کے مسائل سے متعلق خود بھی مضامین لکھے اور مرد ادیبوں کو بھی اس موضوع کی طرف راغب کیا۔ انھیں قدم قدم پر دشواری کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ ایک بڑی تعداد ان کی مخالفت کر رہی تھی اور کوشش کی جا رہی تھی کہ کسی طرح سے اخبار بند ہو جائے۔ یہاں تک کہ خطوط کے ذریعے ایڈیٹر کو گالیاں بھی دی گئیں۔ اس پر اپنے ردِ عمل کا اظہار محمدی بیگم نے اپنی ایک نظم میں اس طرح کیا ہے:

فرقۂ اخبار جو ہے مدعی دردِ قوم
درد جس کا رات دن ہے ہائے قوم اور وائے قوم
جو کہ دردِ قوم میں ہیں رات دن زاری کناں
حبِ وطنی سے بنے جاتے ہیں محبوب جہاں
حامیِ تعلیم نسواں اور جہاں بھر کے لئیق
قوم غم سے اشک جاری اور خلقت پر شفیق
کیا انھوں نے واسطے تہذیب نسواں کے کیا
ان کا دل تہذیب کے حق میں تو پتھر ہوگیا
دل دکھایا جی جلایا کانٹے بوئے راہ میں
یہ صلے اہل وطن سے ہیں ملے بہنو ہمیں

(تہذیب نسواں)

مخالفتوں کے باوجود محمدی بیگم کے قدم نہیں ڈگمگائے اور استقلال کے ساتھ اپنے مشن میں دن رات لگی رہیں۔ انھی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ایک بڑی تعداد خواتین کی ابھر کر سامنے آئی جیسا کہ ''تہذیب نسواں'' کی اس عبارت سے ظاہر ہے:

''تہذیب نسواں'' جاری ہونے سے پہلے مولانا نذیر احمد صاحب کی کتابوں کے سوا لڑکیوں کے لیے مردوں کی تصنیف سے بھی بہت کم کتابیں تھیں۔ مگر ''تہذیب نسواں نے مردوں اور عورتوں دونوں میں کتب تعلیم نسواں کا اس قدر شوق پیدا کر دیا کہ اس مضمون پر اچھی اچھی کتابوں کی معقول تعداد تیار ہوگئی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ مسز سجاد حیدر کے ''اختر النسا'' و ''آہ مظلوماں'' اور بہن م.ظ. کے ''دوشنک بیگم'' بے نظیر قصے ہیں اور اچھے لکھے پڑھے مردوں سے بھی ایسی عمدہ کتابوں کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ سلطان بیگم صاحبہ کی ''رسوم دہلی'' اور مسز صفدر علی کی ''عورتوں کی انشا''، ح.ب. صاحبہ کی ''شہیدی بیگم'' اور عباسی بیگم صاحبہ کی ''ناکمل زہرا بیگم'' اور برج کماری صاحبہ کی ''ذرۂ عظیم'' بھی قابل

تعریف کتابیں ہیں۔ فاطمہ صغرا کی'' خورشید بیگم'' و'' ہمدردنسواں'' کو بھی لڑکیاں بہت خوشی سے پڑھتی ہیں۔ یہ تمام امور ظاہر کررہے ہیں کہ'' تہذیب نسواں'' میں مضامین لکھنے سے لڑکیاں کیسی عمدہ انشا پرداز اور مصنف بنتی جاتی ہیں۔

ایسے وقت میں جب مسلمان عورتوں کی تعلیم کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوں، خواتین کی ایک بڑی تعداد کا لکھنے لکھانے کی جانب توجہ دینا کسی معجزے سے کم نہیں۔ محمدی بیگم نے عورتوں کی اصلاح کے لیے ہرممکن کوشش کی۔ ایک طرف تو وہ خواتین کو'' تہذیب نسواں'' کے ذریعے بیدار کررہی تھیں۔ دوسری جانب اپنی تحریروں کے ذریعے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور فرسودہ رسموں کو بے نقاب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے خواتین کی زبوں حالی، جہالت اور پس ماندگی کو آئینہ دکھایا۔ انھوں نے 1905 میں ماہوار رسالہ ''مشیرنسواں'' بھی نکالا۔ محمدی بیگم نے مختلف کتابیں بھی تصنیف کیں۔ '' رفیق عروس'' 1900 میں، '' انمول موتی'' 1902 میں، '' امتیاز پچیسی'' 1904 میں، '' حیات اشرف'' 1904 میں، '' سچے موتی'' 1905 میں، '' آداب ملاقات'' 1905 میں، '' تاج گیت'' 1905 میں، '' سگھڑ بیٹی'' 1905 میں، '' نعمت خانہ'' 1906 میں، '' دلپسند کہانیاں'' 1906 میں، '' تاج پھول'' 1906 میں، '' پان کی گلوری'' 1907 میں، '' چوہے بلی نامہ'' 1908 میں، '' خواب راحت'' 1912 میں، '' چندن ہار'' 1915 میں، '' علی بابا چالیس چور'' 1915 میں اور '' تین بہنوں کی کہانی'' 1915 میں شائع ہوئیں اور مقبول بھی ہوئیں۔ ان سب کتابوں میں خواتین کے لیے نصیحت آموز مضامین ہوتے تھے۔ مثلاً '' رفیق عروس'' میں نئی دلہن کو خانہ داری سکھانے اور سسرال کو خوش رکھنے کے لیے ضروری آداب بتائے گئے ہیں۔ '' چندن ہار'' میں قرض لینے والی خواتین کے لیے ہدایتوں کو دلچسپ قصے کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ '' تاج پھول'' بھی بچوں کے لیے ہے جس میں آسان زبان اور دلچسپ انداز میں نصیحت آموز باتیں کہی گئی ہیں۔ محمدی بیگم کے بیٹے اور مشہور ڈراما نگار امتیاز علی تاج لکھتے ہیں:

'' یہ سب کتابیں بے حد مقبول ہوئیں اور اس وقت کوئی ایسا تعلیم یافتہ گھرانا نہ ہوگا جس میں ایک ایک نسخہ ان تصنیفات کا موجود نہ ہو اور بہت کم ایسی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہوں گی جن کی نظر سے یہ کتابیں نہ گزری ہوں۔ مرحومہ کو جب کبھی سوسائٹی میں کوئی بات اصلاح طلب معلوم ہوتی تھی۔ وہ گھر آکر فوراً اسے نوٹ کرلیتی تھیں۔ اس کی خرابیاں دلآویز قصے کے پیرائے میں بیان کرتی تھیں اور نصیحت کی کڑوی گولی کو افسانے کی شکر میں لپیٹ کر مریضوں کو دیتی تھیں۔'' (تہذیب نسواں)

معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو اپنی تخلیق کا موضوع بنانے کے لیے ایک حساس طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے جو محمدی بیگم کو خدا نے ودیعت کی تھی۔ ان کے تین ناول منظرعام پر آئے۔ '' صفیہ بیگم'' 1903 میں، '' شریف بیٹی'' 1905 میں اور '' آج کل'' 1912 میں شائع ہوئے۔ '' شریف بیٹی'' میں کہیں نہ کہیں وہ نذیر احمد سے ضرور متاثر نظر آتی ہیں کیوں کہ اس میں '' مراۃ العروس'' کی مانند دو کرداروں انوری اور اختری کو پیش کیا گیا ہے جس میں ایک اچھائیوں اور نیکیوں کی نمائندہ ہے اور دوسری برائیوں کی۔ ناول '' آج کل'' میں محمدی بیگم نے ایک ایسی خاتون فہمیدہ کو مرکزی کردار بنایا ہے، جو فطرتاً لاپروا ہے۔ ہر کام کو دوسرے دن پر ٹال دیتی ہے۔ کسی بھی کام کو فوراً کرنے میں قباحت محسوس کرتی ہے۔ اس کاہلی کا بہت برا انجام اسے دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے گھر میں ایک بوسیدہ دیوار ہے اور وہ اسے اپنی کاہلی کی وجہ سے ٹھیک نہیں کرا پاتی۔ آخرکار دیوار گر جاتی ہے اور اس کا بچہ اس میں دب کر مرجاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا شوہر غصے میں آکر اس کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ فہمیدہ اس غم میں بیمار ہوجاتی ہے اور آخر میں اس کی موت ہوجاتی ہے۔ یہ ایک معاشرتی اصلاحی ناول ہے جس کا پیغام یہ ہے کہ کاہلی اور سستی کا انجام خطرناک ہوتا ہے۔ یہ بات وہ مضمون میں بھی لکھ سکتی تھیں مگر انھوں نے اس کے لیے ناول کا سہارا لیا کہ ناول انسانی ذہن کو زیادہ متاثر کرنے کی قوت رکھتا ہے۔

'' صفیہ بیگم'' بھی ایک اصلاحی ناول ہے۔ اس کا پلاٹ '' شریف بیٹی'' اور '' آج کل'' سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں بچپن کی منگنی کے برے نتائج کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کا اہم کردار صفیہ ہے جو تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اس کی شادی اس کے تایا کے بیٹے صفدر سے اس وقت طے کردی جاتی ہے جب وہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ صفدر بڑا ہوکر غلط صحبتوں میں پڑ جاتا ہے۔ صفیہ ایک تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند لڑکی ہے۔ اس کے لیے اونچے خاندانوں سے بھی رشتے آتے ہیں لیکن اس کے والدین صفدر کی وجہ سے انکار کردیتے ہیں اور جب صفدر خود اس رشتے سے انکار کردیتا ہے تو صفیہ کی شادی ایک تعلیم یافتہ لڑکے سے طے کردی جاتی ہے اور جب شادی ہونے والی ہے اور مہمان شادی میں شرکت کے لیے گئے ہیں تو صفدر کے لالچی والدین زیادہ جہیز کا لالچ دے کر صفدر کو شادی کے لیے تیار کرلیتے ہیں اور زبردستی صفدر سے صفیہ کا نکاح کردیا جاتا ہے۔ صفیہ یہ صدمہ برداشت نہیں کرپاتی اور زہر کھا کر اپنی جان دے دیتی ہے۔ مصنفہ نے صفیہ کی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

'' نکاح میں صرف دو گھنٹے باقی تھے اور یہ بدحواس بیٹھی تھی کہ اب میں کیا کروں گی؟ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جب مجھ سے میری رضامندی پوچھی گئی تو میں نہ ہاں کروں گی اور نہ نا کروں گی۔ جو چاہیں سو کریں۔ جب میرے ماں باپ کو غیرت نہیں تو مجھے کیا ہے۔'' (صفیہ بیگم)

لیکن جب صفیہ کا نکاح بغیر اس کی مرضی کے کردیا جاتا ہے تو وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ مصنفہ اس واقعے کو بڑے دردناک انداز میں پیش

کرتی ہیں:

''چپکے ہی چپکے راتوں رات گڈے اور گڑیا کی طرح نیم جان کا عقد نکاح جان بار صفدر حسین کے ساتھ پڑھا دیا گیا۔ صفیہ نے جب یہ سنا کہ نکاح ہو چکا ہے اور اس سے کسی نے پوچھا تک بھی نہیں۔ تو اس پر جو کچھ گزرا وہ گزرا قلم سے وہ لکھا نہیں جا سکتا زبان سے وہ ادا نہیں ہو سکتا اور کانوں سے وہ سنا نہیں جا سکتا۔ وہ آدمی سے بت بن گئی سانس اب تک چلتی تھی مگر اس میں جان نہ تھی۔ آنکھیں تھیں مگر اسے کچھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ اس کا یہ حال تھا کہ چند ظالم بیبیاں آئیں اور صفیہ کی ناک میں سہاگ کی نشانی نتھ پہنا گئیں۔ (صفیہ بیگم)

پورا ناول نو ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کا آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے۔ اس ناول میں قدیم و جدید دو متضاد ذہنی لہروں کا امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک طرف صفیہ کی ماں قدامت پرست ہیں وہ پڑھائی کو اچھا نہیں سمجھتیں۔ وہیں صفیہ کے والد تعلیم کے حامی ہیں اور صفیہ کو علم حاصل کراتے ہیں۔ مصنفہ نے دونوں متضاد کرداروں کی گفتگو کو بڑے دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے: ''میاں: (ہنس کر) مجھے خطرہ ہے کہ لڑکی کہیں تمھاری ہی نظروں کی نذر نہ ہو جائے۔ وہ جو اچھا کام کرتی ہے تمھیں وہی برا لگتا ہے۔ تمھاری طرح جاہل ان پڑھ رہتی تو تم خوش ہوتیں۔

بیوی: نگوڑے جاہلوں کو خدا تھوڑا ہی پوچھتا ہے؟ تمھارے ہاتھ رزق ہوتا تو تم جاہلوں کو بے آب و دانے ہی کے مار ڈالتے۔ شکر ہے تمھاری بیٹی نے پڑھ کر چار دیدے کر لیے۔ در گور ایسا علم۔ جھاڑو پھیروں ایسی لیاقت پر۔ نہ بیٹیوں والا ڈھنگ ہے نہ تمیز۔ سینے پرونے کی رہی اور نہ کھانے کی۔ کر رہی ہے تو کیا بت بنا رہی ہے۔ پھوڑے پھنسی چیرے لہو پیپ میں ہاتھ لبیڑے بیٹھی ہے یا کتاب لیے کرسی پر ٹنگی ہے۔ یہ اچھے ڈھنگ سکھائے ہیں! خدا ہی ہے جو کسی گھر میں ان ڈھنگوں کی سمائی ہو۔'' (صفیہ بیگم)

محمدی بیگم کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ انھوں نے سو سال قبل ناول کے ذریعے ایک ایسی لڑکی کا کردار پیش کیا جو تعلیم یافتہ ہے، ڈاکٹری بھی جانتی ہے۔ پینٹنگ میں بھی ماہر ہے اور اس کے مضامین بھی اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک ایسا کردار بھی پیش کیا جو شادی کے لیے لڑکی کی مرضی کو ترجیح دیتا ہے۔ اسلام میں شادی کے لیے لڑکی کی مرضی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ محمدی بیگم اس خیال کو ناول میں ناصر نام کے کردار کے ذریعے بڑے سلیقے سے پیش کرتی ہیں:

''اصغر حسین: ایسے معاملوں میں لڑکیوں کے بولنے کا کیا کام؟ کیا وہ ہم سے زیادہ سمجھ دار ہے؟

ناصر: سمجھ دار تو نہیں۔ لیکن پھر بھی گزران تو اسی کو کرنا ہے۔

اصغر حسین: نہیں صاحب یہ بے شرم بیہودگی مجھ سے ممکن نہیں کہ میں بیٹی کے عقد میں بیٹی سے ہی رائے لوں۔ اس سے بڑھ کر کوئی نامعقول حرکت ہو سکتی ہے؟

ناصر: آپ کی مرضی نہیں تو نہ کیجیے۔ مگر للہ ایسے نامناسب الفاظ زبان سے نہ نکالیے۔ جناب رسول خدا کا فرمودہ ہے اور ازواج مطہرات کا اسی طریق پر عمل درآمد رہا ہے۔ خدا کے غضب سے ڈرو۔ پیغمبر کی سنت کو نامعقول حرکت نہ کہو۔'' (صفیہ بیگم)

مصنفہ نے بڑی سلیقہ مندی سے بچپن کی منگنی کے مضرات کو بیان کیا ہے۔ کردار نگاری میں چابکدستی ہے۔ زبان میں تخلیقیت اور طنز و مزاح کی چاشنی ہے۔ روزمرہ کے الفاظ اور محاوروں کا بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ اشعار کے استعمال سے یہ حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

محمدی بیگم کی تصانیف نے اس دور کی خواتین کو بہت متاثر کیا اور خواتین کے ایک بڑے حلقے نے نہ صرف ان سے ذہنی، فکری تاثر قبول کیا بلکہ تخلیق کے باب میں انھیں مشعل راہ سمجھ کر ان کی پیروی کی۔ محمدی بیگم کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ادب میں صنفی تعصب کا خاتمہ کیا اور عورتوں کے حجاب میں رہتے ہوئے بھی ان کے لیے احساس و اظہار کی آزادی کی راہیں ہموار کیں۔ ان کے بعد یہ قافلہ آگے بڑھتا رہا اور اب موجودہ صدی میں خواتین ادبی منظرنامے پر اتنی مستحکم اور مضبوط ہو گئی ہیں کہ باضابطہ تانیثی ادب کے حوالے سے ڈسکورس کا آغاز ہو گیا ہے۔

□□□

پتہ:
P-77, Sector-11,
Noida-201301, U.P.

دکنی نثر کا انتخاب
مرتبہ: سیدہ جعفر
دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔
صفحات: 168، قیمت -/45 روپے

اقبال حسین

1857-58 کے مجاہدین آزادی

1857 کی پہلی جنگ آزادی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ جنگ ہتھیاروں کے علاوہ اعلانیوں اور حکم ناموں کے ذریعے بھی لڑی گئی تھی جو مجاہدین آزادی نے اردو اور ہندی زبانوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے شائع کیے تھے۔ اس جنگ کی ابتدا بنگال آرمی کے فوجیوں نے کی تھی، بعد میں عوام اور خواص بھی مختلف وجوہات سے اس میں شامل ہوتے گئے۔ مجاہدین آزادی نے عام ہندوستانیوں کی مدد حاصل کرنے اور ان کی قومی حمیت کو بیدار کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً بہت سے اعلانیے جاری کیے تھے، افسوس ہے ان اعلانیوں کے اصل متن اب کم یاب ہیں۔ 1858 میں یہ متن موجود تھے، انگریزی حکومت نے مجاہدین آزادی کے خلاف دائر کردہ مقدمات میں بہ طور ثبوت ان کے انگریزی تراجم پیش کیے تھے جو نیشنل آرکائیوز نئی دہلی، یوپی آرکائیوز الہ آباد اور گورکھ پور کے سید حامد علی صاحب کے کتب خانے میں موجود اعلانیوں کے کچھ اصل متن حاصل کیے ہیں۔ یہ زیادہ تر اردو زبان میں ہیں۔ تمیں اعلانیے اردو اور ہندی زبانوں میں شائع شدہ ایک ساتھ ملے ہیں اور کئی اعلانیے فارسی میں ہیں۔ ان اعلانیوں کو ہم ان کے مضمون کی روشنی میں تین مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے دور کے اعلانیوں میں عوام کو بڑے جوش اور عزم محکم کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے انگریزوں کے جبر و استحصال کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی بد اعمالیوں، ہندوستانی مذاہب، ہندومت اور اسلام دشمنی کی وجہ سے ان کے استیصال پر زور دیا گیا ہے اور ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت بتلائی گئی ہے۔ دوسرے دور کے اعلانیوں میں ہندوستانی فوجیوں کی انگریزوں کے خلاف جنگ آزمائی، ہندو مسلم اتحاد پر زور، ایک دوسرے کے مذہب کے تحفظ، انگریزوں کے مکمل اخراج، نئی حکومت کے قیام کے بعد اچھے انتظامیہ، آزادی مذہب، بہتر زرعی اور مالی بندوبست وغیرہ کے وعدے ہیں۔ تیسرے دور کے اعلانیوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مجاہدین آزادی مشکلات سے دوچار تھے اور دفاعی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان میں عوام اور خواص سے پرزور اپیل ہے کہ وہ دل و جان سے انگریزوں کے خلاف متحد ہو کر جنگ آزما ہوں اور اپنے اپنے دین کا تحفظ کرتے ہوئے دوسرے کے مذہب کی بھی انگریزوں سے حفاظت کریں۔ جنگ میں نمایاں کارکردگی کے لیے انعام و اکرام سے نوازے جانے کے بھی وعدے کیے گئے ہیں۔ ہندوستانی عوام کو یہ بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر انگریز دوبارہ برسراقتدار آ گئے تو ہندوستانیوں کا کیا حال ہوگا۔ اس مضمون کے لیے صرف چند فرامین، اعلانیوں اور حکم ناموں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ زیادہ تر اعلانیے اردو زبان میں ہیں، اگر ہم انیسویں صدی کے وسط میں شائع ہونے والے اخبارات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے زیادہ تر ہندوستانی زبان اور فارسی رسم الخط میں شائع ہو رہے تھے جو اردو زبان کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ یہ اردو اخبارات زیادہ تر ہندوؤں کی ملکیت میں تھے اور وہی ان کے ایڈیٹر اور پبلشر بھی تھے۔ اس سے یہ امر واضح ہے کہ اس وقت تک اردو زبان ایک مشترکہ قومی زبان کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا چکی تھی جس کی نشو و نما اور فروغ میں ہندو اور مسلمانوں، دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ 1857-58 کے مجاہدین آزادی کے جاری کردہ اعلانیوں سے اس کی مزید توثیق ہو جاتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اردو زبان، ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان تھی، آیئے اب ہم ذرا ان اعلانیوں، حکم ناموں اور فرامین پر بھی نظر ڈالتے چلیں جو اس مضمون کا اصل موضوع ہیں۔

پہلی جنگ آزادی کے اعلانیوں سے نہ صرف مجاہدین آزادی کے جذبات کا پتا لگتا ہے بلکہ ان مسائل سے بھی آگاہی ہوتی ہے کہ وہ اتنی بڑی جنگ کیوں لڑ رہے تھے، انھوں نے عوام سے کیا کیا وعدے کیے تھے اور ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے کیا جتن کر رہے تھے اور ملک کو آزاد کرانے کے بعد اسے کن خطوط پر چلانا چاہتے تھے۔

اعلانیوں کے مطالعے سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ مجاہدین آزادی جن کی قیادت زیادہ تر انگریزی فوج کے ہاتھوں میں تھی، انگریزوں کی مذہب دشمنی، اقتصادی استحصال، نسلی امتیاز، حد سے زیادہ ٹیکسوں کا نفاذ، زرعی پالیسی، کساد بازاری، بے روزگاری اور ہندوستانی صنعتوں کے بہ تدریج زوال کو وہ گذشتہ ایک صدی سے برداشت کرتے رہے تھے۔ وہ بدحالی اور غربت کے باوجود خاموش اور صابر تھے لیکن ان کے صبر کا پیمانہ اس وقت چھلک گیا جب انگریزی حکومت کے زیر سایہ عیسائی مشنریوں کے ذریعے تبدیلی مذہب کی منصوبہ بند کوشش شروع کی گئی۔ یہ ایسا قدم تھا جس نے ان وفادار فوجیوں کو بھی انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا، جنھوں نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام اور استحکام میں گذشتہ ایک صدی کے دوران نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ 10 مئی 1857 کو میرٹھ میں علم آزادی بلند کرنے کے بعد باغی فوجیوں کی ٹولی دہلی پہنچی اور 11 مئی 1857 کو ان کا پہلا اعلانیہ شائع ہوا جس میں انھوں نے انگریزی حکومت پر الزام لگایا تھا۔

''سب ہندو مسلمان رعایا اور ملازم ہندوستانیوں کو افسران فوج انگریزی مقیم دہلی میرٹھ کی طرف سے دریافت ہووے کہ اب سب فرنگیوں نے ایکا کیا ہے کہ اول سب فوج ہندوستانی کو بے دھرم کر کے پھر رعایا کو بزور تدبیر کرستان کر لیں، چنانچہ ہم سب نے فقط دین کے واسطے معہ رعایا کے اتفاق کر کے ایک

کافر کو زندہ نہ چھوڑا اور بادشاہت دہلی اس عہد پر قائم کیا کہ فوج کمپنی فرنگیوں کو قتل کرے۔"

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ اعلانیہ بنگال آرمی کے فوجیوں نے جاری کیا تھا جن میں اکثریت اونچی ذات کے ہندوؤں کی تھی۔ اعلانیہ میں آگے یہ بھی کہا گیا تھا کہ "اب لازم یہ ہے کہ جس کو کرستان ہونا دشوار ہووے، رعایا اور فوج ہر مقام کی ایک دل ہو کر ہمت کرے اور تخم ان کافروں کا باقی نہ رکھیں۔"

اعلانیہ میں ہندو اور مسلمانوں کے مذہب کے تحفظ اور کرستانوں یعنی انگریزوں کے خلاف شدید نفرت اور غصہ کا اظہار بے بنیاد نہ تھا۔ ہم عصر پادری اور مبلغ شیرنگ کے الفاظ ہیں:

"The whole land has been shaken by missions to its innermost centre. The Hindoo treebles for his religion, the Mohammadan for his. Both religons seem to be crumbling away from beneath them."

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ اعلانیہ میں انگریزوں کو کافر بتلایا گیا ہے جو عیسائی تھے، یعنی اہل کتاب تھے جن کے ساتھ مسلمان رشتۂ ازدواج قائم کر سکتے تھے، تاہم اس لفظ کا استعمال مہاراجہ پیشوا نانا صاحب، رانی جھانسی، خان بہادر خاں، برجیس قدر، دوور پنت، بہادر شاہ ظفر، شہزادہ فیروز شاہ اور مولوی لیاقت علی کے اعلانیوں میں بار بار ہوا ہے اور انگریزوں کو نصاریٰ، کافر ہی کہا گیا ہے۔ نانا صاحب اپنے ایک اعلانیہ میں لکھتے ہیں:

"کافر انگریزوں نے اس حد تک مظالم، بدمعاشیاں، ناانصافیاں کی ہیں جن کی وجہ سے ایشور نے ان کافروں کو سزا دینے اور اکھاڑ پھینکنے، نیز سابق ہندو اور مسلمان حکومتوں کو دوبارہ قائم کرنے اور ملک کے تحفظ کے لیے مجھے متعین کیا ہے۔"

اعلانیوں کے انداز بیان سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ مجاہدین آزادی ہندو دھرم اور اسلام کے تحفظ کو کس قدر اہمیت دے رہے تھے اور اس فرض کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے دھرم یدھ یا جہاد چھیڑ دیا تھا، اودھ میں ایک عام تصور یہ تھا کہ مذہب تو صرف دو ہی ہیں:

"دین تو دوئی دین، ہندو کا دھرم اور مسلمان کا ایمان۔"

مجاہدین آزادی، ہندوستانی مذاہب کے متعلق جو جذبات رکھتے تھے وہ ان کے اس نعرے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے:

"وہ ایک پتا کے دوئی چتر، ایک ہندو ایک ترک، ان کا چولی دامن کا ساتھ۔"

درگا داس بندوپادھیائے، انگریزی فوج میں ملازم اور بریلی میں متعین ایک اور نعرہ کا ذکر کرتا ہے جو مجاہدین آزادی بریلی میں لگا رہے تھے:

"ہندو مسلمان ایک، رام رحیم ایک، شری کرشنا اللہ ایک۔"

یہ جذبات اور مذہبی رواداری ایک دن کی پیداوار 1857 کے حالات کے پیش نظر سیاسی مصلحت پر مبنی نہیں تھے بلکہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہندوستان میں صدیوں کے اتحاد، ایک ساتھ رہنے سہنے اور ایک دوسرے کے نظریات اور مذہبی افکار سمجھ لینے کے بعد پیدا ہوئے تھے، ہندوستانی عوام اور فوجی، اپنی اس اساس کو ہر قیمت پر بچانا چاہتے تھے، جس کو انگریزی حکومت نے عیسائی مشنریوں اور اپنی حکمت عملی سے خطرہ میں ڈال دیا تھا، رام بخش جنرل آف فرسٹ ڈویژن، متارام بریگیڈ میجر نے مجاہدین آزادی کے کیمپ سے مہاراجہ جنگ بہادر، نیپال کے نام اپنی عرضی میں لکھا تھا کہ ایک صدی تک ان کے مورثین نے انگریزوں کی ملازمت ایمان داری کے ساتھ انجام دی تھی جس کی بدولت وہ اس ملک کے مالک بن گئے لیکن انھوں نے ہمارے مذہبی جذبات کا خیال نہ کرتے ہوئے ایسے کارتوس بنائے جن میں سور اور گائے کی چربی کی آمیزش تھی جس کے ذریعے ہمارا دھرم خراب کرنا چاہتے تھے۔ ان کی عرضی کی یہ سطریں قابل توجہ ہیں:

"اس سے پہلے بھی ہندوستان میں بہت سے بادشاہ گزرے ہیں لیکن کسی نے بھی ہمارا دھرم اور ایمان خراب کرنے کی کوشش نہیں کی، اگر کسی ہندو یا مسلمان کا مذہب ہی ختم ہو جائے تو پھر دنیا میں کیا رہ جائے گا۔"

یہی وہ جذبات تھے جس کی وجہ سے باغی انگریز فوج کے سپاہی بلالحاظ مذہب، دین اور دھرم کے تحفظ کے لیے انگریزوں سے محاذ آرا ہوئے تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز جس مذہب کی پیروی کرتے ہیں وہ باطل ہے۔ وہ تین خداؤں میں یقین کرنے والے تھے جب کہ ہندو اور مسلمان وحدانیت کے قائل تھے۔ اسی لیے ہندوستان میں ہندو، مسلمان، آتش پرست اور یہودی ان کے مذہب کو سچا مذہب نہیں تسلیم کر سکتے تھے۔ مجاہدین آزادی پہلی جنگ آزادی کے دوران اسی موقف پر قائم رہتے ہوئے انگریزی حکومت سے جنگ آزما ہے۔

1857 کے اعلانیوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باغی فوجیوں کو عوام کی حمایت حاصل تھی، وہ انگریزوں کے جابرانہ رویے کے نہ صرف شاکی تھے بلکہ ان کو یقین تھا کہ انگریزوں کی حکومت میں ہندوستانیوں کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہیں تھی۔ وہ انگریزوں کے فریب اور شاطرانہ چالوں کو خوب سمجھ رہے تھے، کیوں کہ وہ ہندو اور مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے تھے۔ حد سے زیادہ مال گزاری عاید کر کے، اس کی جبراً وصولی اور عدم وصولی کے بدلے میں زمین داریوں کے نیلام نے بہت سے زمین داروں اور ان سے منسلک رعیت کو تباہ کر دیا تھا۔ انگریزوں نے اعلا اور قیمتی اشیا کی برآمد درآمد پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ ہندوستانیوں کو اعلا ملازمتوں سے محروم کر رکھا تھا۔ ہندوستانی فوجیوں کی تنخواہیں انگریز اور یورپین ملازمین فوج کے مقابلے میں بہت کم تھیں۔ انگریزی حکومت کی درآمد اور برآمد کی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوستانی دستکار، کاریگر غربت اور فاقہ کشی کا شکار تھے۔ پنڈتوں اور علما کا بھی حال برا تھا۔

(الف) اعلانیوں کے ذریعے مجاہدین آزادی نے عوام کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستانیوں کی عمل داری قائم ہونے کے بعد سب کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی، جیسے پہلے تھی اور ہر آدمی اپنے دین دھرم پر قائم رہے گا۔ عزت و آبرو ہر شخص کی قائم رہے گی اور کسی بے گناہ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ کسی کا مال زور زبردستی سے نہیں حاصل کیا جائے گا اور عورتوں کی عزت و ناموس کی حفاظت ہوگی۔ شہزادہ فیروز شاہ نے اپنے اعلانیے میں یہ بھی یقین دلایا تھا کہ بادشاہی عمل داری کے قیام کے بعد ملک کے ہر طبقے کو تجارت اور ملازمت میں سہولت حاصل ہوگی اور زمین داروں کو بھی انگریزوں کے جابرانہ نظام سے راحت ملے گی۔

1857-58 کے اردو اعلانیوں کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے، مثلاً خان بہادر خاں کا اعلانیہ عربی کی مہر ''الحکم للہ والملک للہ'' سے شروع ہوتا ہے۔ مہر کے ٹھیک ''نیچے'' دھرم کی فتح کا خط'' تحریر ہے۔ یہ ایک طویل اعلانیہ ہے جو روہیل کھنڈ کے راجاؤں کے نام ہے۔ اعلانیہ سے چند ابتدائی جملے پیش کیے جارہے ہیں تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ مجاہدین آزادی کی آڑ لیاں تھیں، وہ کس نہج پر سوچ رہے تھے اور وہ کیا چاہتے تھے:

'' آپ سب راجا لوگ بڑے دھرم اور خوبیوں والے ہو اور سخی داتا، برداشت کرنے والے بہادر اور سنبھالنے والے اپنے دھرم اور اوروں کے دھرم کے ہو...... اور خدا تعالیٰ نے اپنا اپنا دھرم کرنے کے لیے یہ سرپرتم کو دیا ہے...... اور اپنے دھرم کو خراب کرنے والوں کو مارنے کے واسطے خالق نے تم راجہ لوگوں کو پیدا کیا ہے۔''

برجیس قدر کے اعلانیہ مورخہ 25 جون 1858 میں مجاہدین آزادی کے جذبات سیدھے سادے الفاظ میں ظاہر کیے گئے ہیں:

'' سب ہندو اور مسلمان یہ جانتے ہیں کہ چار چیزیں ہر ایک مانس کو بہت پیاری ہیں۔ اول دین و دھرم، دوسرے عزت و آبرو، تیسرے جان اپنی او راپنوں کی، چوتھے مال واسباب۔''

لیکن بعض اعلانیے جیسے مولوی لیاقت علی کا الہ آباد اعلانیہ فارسی آمیز اردو اور قرآنی آیات کے اقتباسات سے خاص طور سے مسلمانوں کو جہاد کے لیے آمادہ کرنے کی نیت سے لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس اعلانیے کی ابتدا حمد باری تعالیٰ، درود وسلام نبیؐ، صحابۂ کرام اور تابعین سے ہوتی ہے، اس اعلانیے میں قرآن پاک کے حوالے سے ''کفرہ فجرہ نصاریٰ'' کے خلاف عوام کو بالخصوص مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہے، کیوں کہ برجیس قدر، تمام راجگان قلم رو لکھنؤ و راج گان قرب و جوار الہ آباد بالا تفاق اندفاع قوم نصاریٰ طاغی باغی کے ہو چکے تھے۔

ایک اور اہم اعلانیہ رسالہ فتح اسلام 1857 کی جنگ آزادی کی ایک بیش قیمت دستاویز ہے، اس رسالہ کو جاری کرنے والے کا نام نہیں ملتا، تاہم رسالے کے متن اور دیگر تفصیلات سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اسے مولوی احمد اللہ شاہ نے جو فیض آباد کے مولوی کے نام سے بھی معروف ہیں جاری کیا تھا۔

اس طویل رسالے میں انگریزوں کے مظالم کی خوں چکاں داستان کے بعد عوام کو جہاد میں شریک ہونے کی پرزور اپیل کی گئی ہے۔ اس میں رسالے کی زبان عام فہم اور عربی و فارسی کے الفاظ کی آمیزش کم ہے، رسالہ میں مجاہدین آزادی کو آداب جنگ بتلائے گئے ہیں جیسے ان کو کوچ اور مقام کے درمیان لوٹ مار سے گریز کرنے، جہاں فتح حاصل ہو وہاں کی رعیت کی حفاظت کرنے اور لوٹ مار کرنے والوں کو سخت سزا دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس رسالے میں قیادت کے مسئلے پر بھی ہدایت دی گئی ہے جو دلچسپ ہے، اس میں واضح کیا گیا ہے کہ انگریزوں کی تابع داری نہیں کرنی چاہیے، یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں قیادت کے مختلف مرحلوں کا ذکر کیا گیا ہے:

'' عقل اور دین کی شرم بھی یہی کہتی ہے کہ بکشور یہ کافرہ اور دین کی دشمن انگریزوں کی تابع داری سے مسلمان امیر کی تابع داری اور بادشاہ کے تابع دار راجہ کی تابع داری کروڑوں درجہ افضل ہے...... اور سب ہندو دل و جان سے مطیع الاسلام اور بادشاہ کے خیر خواہ تھے تو اب بھی وہی ہندو اور وہی مسلمان ہیں اور وہی کتاب ہے، اپنے دین پر دئے رہے ہیں اور ہم اپنے دین پر رہیں گے۔ ہم ان کی مخالفت کریں گے، وے ہماری مدد اور محافظت کریں گے۔ نصاریٰ مردود نے ہندو اور مسلمان دونوں کو کرغلطان کرنا چاہا تھا، اللہ نے خیر کیا الٹے وے آپ ہی خراب ہوں گے۔''

اس رسالے کے آخر میں انگریزوں سے کسی قسم کا ربط وضبط نہ قائم رکھنے پر زور دیا گیا ہے اور اپیل کی گئی ہے:

'' سارے ہندو اور مسلمان ان کی کسی قسم کی نوکری نہ کریں اور ان کی نوکری میں پنڈت اور مولوی کے قتل کی شراکت سمجھیں۔''

1857 میں اور کسی مقام کی بہ نسبت دہلی سے بہت سے فرامین، اعلانیے اور حکم نامے جاری ہوئے تھے جو زیادہ تر اردو میں اور چند فارسی میں ہیں، یہ دستاویزات نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں محفوظ ہیں، میرے خیال میں 1857 کی جنگ آزادی کی یہ دستاویزیں شاہی دفتر خانہ سے تمام وکمال انگریزوں کے ہاتھ لگ گئی تھیں، اسی لیے اور مقامات کے مقابلے میں یہ زیادہ مکمل اور تسلسل کے ساتھ موجود ہیں جن سے دہلی کی 1857 کی مکمل تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ یہ دعویٰ کرنا مناسب نہ ہوگا کہ اس سے پہلے کسی ہندوستانی محقق نے ان دستاویزات کو نہیں دیکھا، کیوں کہ پروفیسر مہدی حسن اور سید اطہر عباس رضوی نے ان دستاویزات کا خاصہ استعمال اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ بہرحال اس مضمون میں ضمناً چند اعلانیوں اور فرامین کے حوالے پیش کیے جارہے ہیں۔ 1857 میں دہلی پر مجاہدین آزادی کے غلبے کے بعد نئی آزاد حکومت گوناگوں مسائل سے دوچار ہوئی تھی۔ امن وامان برہم ہو چکا تھا۔ دہلی اور قرب وجوار کے تھانوں سے روزمرہ کے احوال کی رپورٹ آنی بند ہو چکی تھی۔ بہادر شاہ نے اپنے حکم نامہ مورخہ 19 مئی 1857 کے ذریعے تمام تھانے داروں کو معمول کے مطابق رپورٹ بھیجنے کی تاکید کی تھی اور یہ سخت ہدایت دی تھی کہ وہ اپنے اپنے

تھانوں پر موجود رہیں اور شہر میں امن و امان بحال کریں۔ شہر میں پابندی سے گشت لگائیں اور شہر میں ہونے والے واقعات کی مکمل رپورٹ کوتوال کو بھیجتے رہیں۔ حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف سخت سزا کی تجویز کی گئی تھی۔

بہادر شاہ کی تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود دہلی کے عوام، بالخصوص تاجر لوٹ مار کی وارداتوں سے پریشان تھے۔ 13 مئی کو بہادر شاہ نے چاندنی چوک کا دورہ کر کے لوگوں کی ہمت بڑھائی تھی جس کی وجہ سے دوکانیں کھلنی شروع ہوئی تھیں، لیکن دوکان داروں نے جلد ہی دوکانیں بند کریں۔ 11 جون 1857 کے فرمان میں بہادر شاہ نے کوتوال شہر کو ہدایت دی کہ وہ اعلان کریں، تاکہ دوکان دار اپنی دوکانیں بے خطر کھول سکیں۔ یہ بھی ہدایت دی تھی کہ دوکان داروں کے تحفظ کا پورا انتظام کیا جائے برق اندازوں اور چوکی داروں کے ذریعے دن رات عوام کی خبر گیری کی جائے، مگر بہادر شاہ کی توجہ اور حکم کے باوجود شہر کے حالات میں کوئی بہتری نہیں ہوئی۔ خوف زدہ دوکان داروں نے بہادر شاہ سے صورت حال کی ابتری کی شکایت کی۔ بے بس بادشاہ نے جن کے پاس نام کے سوا کچھ نہ تھا، 9 اگست 1857 کو فوج کے تینوں شعبوں کے افسران کے نام جاری کردہ حکم نامے میں اپنے غم اور افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ اگر یہی صورت حال جاری رہی تو شہر کیسے خوش حال رہ سکے گا۔ عوام بھی تکلیف اٹھائیں گے۔

ہر چند کہ مجاہدین آزادی نے انگریزوں کو دہلی سے خارج کر دیا تھا لیکن وہ دہلی سے دور بھی نہیں تھے اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ ان کو امید تھی کہ آنے والی بقرعید کے موقعے پر وہ دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گاؤکشی کے مسئلے پر پھوٹ ڈالنے اور امن وامان درہم برہم کرانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ بہادر شاہ نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر اپنے معتمد جنرل بخت خاں کو حکم دیا تھا کہ گاؤکشی پر پابندی کا حکم جاری کریں۔ بخت خاں نے 28 جولائی سے 31 جولائی 1857 کے درمیان کئی حکم نامے اور اعلانیے جاری کیے تھے جن میں گاؤکشی گائے کی خرید وفروخت اور اس کے گوشت کی دہلی میں درآمد پر مکمل پابندی کے احکام تھے۔ حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو موت کی سزا تجویز کی گئی تھی۔ سخت احتیاط اور نگرانی کی وجہ سے بقرعید کا تہوار بخیر وخوبی گزر گیا، تاہم انگریزوں کا خطرہ بہ دستور قائم رہا۔ انھوں نے دہلی کے قریب پہاڑی پر قبضہ کر کے اپنی فوجی چوکیاں قائم کر لی تھیں۔ انگریزوں کی برتر فوجی پوزیشن نے بہادر شاہ کو بے چین کر دیا تھا، انھوں نے پہاڑی پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے کئی حکم نامے جاری کیے تھے۔ 10 ستمبر 1857 کے حکم نامے میں انھوں نے جو لکھا تھا وہ بادشاہ کی ذہنی حالت بتلاتا ہے:

''ہندو کو گائے اور مسلمان کو سور کا لحاظ کر کے اور دین و دھرم کو سمجھ کر بس کہ، میری زندگی تم کو عزیز ہو تو دیکھتے ہی اس حکم نامے کے پلاٹن و رسالہ و توپ خانے سب تیار کر کے اوپر کشمیری دروازہ کے حاضر ہو کر مخالفان نا نجار و کفاران بدافعال پر دھاوا کرو، اس باب میں ایک لحظہ تامل اور تغافل نہ کرو...... تم اس تخت کی شرم رکھو اور جو دین اور ایمان پر آئے ہو تو اس کا لحاظ کرو۔''

1857-58 میں جاری کردہ اردو اعلانیوں کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں بے تکلفانہ ہندی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جیسے سرپر، ریت، رانڈ، دھرم ستی، راج دہن، پوتر، دیش، مانس، ماس، لکا چھپا، دھاوا، ایکا، داتا وغیرہ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی تک اردو اور ہندی کا کوئی قضیہ نہیں تھا لیکن 1857 میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے مذہب کے متعلق عقیدت اور تحفظ کا اظہار کیا تھا اور وہ انگریزوں کے عیسائی بنانے کی مہم کے خلاف متحد ہوگئے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو اپنی بے مثال یک جہتی اور اتحاد سے مغلوب کر دیا تھا۔ انگریزوں کے لیے ہندو مسلم اتحاد ان کے مفاد کے لیے سخت خطرہ تھا، اس لیے وہ اسے ہر صورت سے توڑ دینا چاہتے تھے۔ ان کے خفیہ مراسلات اس امر کے شاہد ہیں، مثلاً 10 مئی 1858 کو لارڈ الفنسٹن نے گورنر بمبئی کو لکھا تھا:

''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' قدیم رومن مقولہ کو اپنا لینا چاہیے، میں شاید اپنے اس پختہ خیال کے اظہار میں پس و پیش کرتا، اگر میں نے اپنے نظریے اور ڈیوک آف ولنگٹن کے نظریے میں مماثلت نہ پائی ہوتی۔''

وقت کے ساتھ ساتھ یہ نظریہ زور پکڑتا گیا، چناں چہ 10 مئی 1862 کو چارلس ووڈ نے وائسرائے الگن کو لکھا تھا:

''ہم نے اپنے اقتدار کو ایک دوسرے سے لڑا کر قائم کیا ہے اور ہمیں ایسا ہی کرتے رہنا چاہیے، لہٰذا سب کے جذبات کو ہم آہنگ ہونے سے روکنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔''

اس سے پہلے چارلس ووڈ نے 19 مئی 1862 کو لکھا تھا:

''ہم ہندوستان میں اپنے اقتدار کی بقا کے لیے کسی بھی طریقے کو نظر انداز نہیں کر سکتے، قوموں کی فطری دشمنی ہماری طاقت کا معمولی جز نہیں ہے اس پر انحصار کرو، اگر سارا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہوگیا تو ہم کتنے عرصے تک خود کو سنبھال سکیں گے۔''

ان اقتباسات کی روشنی میں 1858 کے بعد برطانوی حکمت عملی کے تحت ہندوستانیوں پر کیا گزری، ہندوستان کی سیاست نے کتنی کروٹیں لیں اور کس کس طرح کی تحریکات پیدا ہوئیں، تقسیم بنگال (1905) سے تقسیم ہندوستان تک کیا کیا گزرا، اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے، آج ہم 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سو سالہ تقریب منا رہے ہیں، اگر ہم صرف 1857 کے مجاہدین آزادی کے اغراض و مقاصد، ہندوستان کے دونوں بڑے مذاہب ہندو دھرم اور اسلام کے متعلق ان کے نظریات کو سمجھ کر ملک میں عام کریں تو ملک سے روز افزوں فرقہ وارانہ ناسور کو ختم کرنے میں کامیاب ہو کر شہیدان 1857 کو صحیح خراج عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔

(بشکریہ ماہ نامہ ''معارف'' اعظم گڑھ)

□□□

فیروز بخت احمد

زلیخا بیگم کی قبر

مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم کا انتقال 9 اپریل 1943 کو 19 اے۔ بی گنج سرکلر روڈ کلکتہ کے مکان میں ہوا تھا۔ نماز جنازہ بڑی مسجد ناخدا میں پڑھائی گئی اور رمانک تلہ کے علاقے میں واقع کچھی میمن ناخدا قبرستان میں تدفین ہوئی۔ مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین اور والدہ نیز بڑے بھائی غلام یٰسین آہ اور بہن بھی اسی قبرستان میں مدفون ہیں۔ مولانا کے والد اور والدہ کی قبریں ایک حجرے میں ہیں اور سالانہ عرس ہوتا ہے۔ زلیخا بیگم کی قبر اسی جگہ ایک گوشے میں ہے۔ مولانا آزاد کا انتقال 22 فروری 1958 کو دہلی میں ہوا اور ان کا مزار جامع مسجد کے سامنے آزاد پارک میں ہے۔

بیگم آزاد کی قبر پر کوئی کتبہ نہیں تھا۔ عام لوگوں کے لیے شناخت کرنا مشکل تھا کہ مرحومہ کی قبر کون سی ہے۔ اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز نے طے کیا کہ زلیخا بیگم کی قبر پر لوح نصب کی جائے۔ لوح مزار چار زبانوں میں لکھ کر نصب کر دی گئی ہے۔ 22 اپریل 2002 کو لوح مزار کی نقاب کشائی قبرستان میں منعقد ایک تقریب میں ہوئی۔

زلیخا بیگم کا جب انتقال ہوا تو مولانا آزاد قلعہ احمد نگر میں 'کوئٹ انڈیا' تحریک کے سلسلے میں اگست 1942 سے قید تھے اور اپنی اہلیہ کی جان لیوا بیماری کی خبر سن کر بھی مولانا نے پیرول پر رہا ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ مولانا نہ تو اپنی رفیقۂ حیات کو بیماری کی حالت میں دیکھنے آئے اور نہ ان کی وفات پر جنازے میں شریک ہو سکے۔ حکومت برطانیہ کی کوئی رعایت بھی اس مجاہد آزادی کو قبول نہیں تھی۔ 1945 میں مولانا اور دوسرے کانگریسی لیڈر احمد نگر قلعے سے رہا کیے گئے۔ مولانا کو پہلے بانکوڑہ لایا گیا اور چند روز وہاں نظر بند رکھنے کے بعد چھوڑا گیا۔ مولانا ٹرین سے ہوڑہ اسٹیشن پہنچے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے 1940 سے صدر تھے۔ ہوڑہ اسٹیشن پر ایک خلقت مولانا کے استقبال کے لیے ٹوٹ پڑی۔ بہت بڑا جلوس نکلا۔ استقبال کے لیے بینڈ باجا بھی آیا تھا جسے بجانے سے مولانا نے منع کر دیا۔ استقبالیہ جلوس ہوڑہ اسٹیشن سے چلا تو مولانا نے اس کا رخ مانک تلہ قبرستان کی طرف موڑ دیا جہاں ان کی بیگم محو خواب تھیں۔ قبر پر پہنچ کر مولانا نے سب سے پہلے فاتحہ پڑھی پھر کچھ دیر خاموش کھڑے قبر کو دیکھتے رہے اور اپنی گاڑی پر پڑے ہوئے پھولوں میں سے ایک ہار اٹھا کر قبر پر رکھا اور رہائش گاہ بالی گنج سرکلر روڈ کے لیے روانہ ہوئے۔

اپنی آخری کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں فرماتے ہیں:

''ہوڑہ اسٹیشن پر اور پلیٹ فارم پر انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے ڈبے سے باہر نکلا اور کار میں سوار ہوا۔ تین سال پیچھے کا وہ دن یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھیں۔

اب تین سال کے بعد واپس آ رہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا۔ مجھے ورڈس ورتھ کا یہ مصرع یاد آیا:

''مگر وہ اب اپنی قبر میں ہے اور ہائے میری دنیا کیسی بدل گئی ہے۔''

(ترجمہ)

آج وہ گھر خالی تھا جس میں مرتے دم تک زلیخا بیگم نے ہر اچھے برے وقت میں مولانا کی رفاقت کی۔ مولانا کی زندگی کا ایک بڑا حصہ قید و بند میں گزرا اور زلیخا بیگم کو مہینوں کیا برسوں اکیلا رہنا پڑتا تھا۔ مولانا جیل سے باہر ہوتے تب بھی قومی کاموں کے لیے اکثر سفر میں رہتے۔ زلیخا بیگم کو ہمیشہ حالت انتظار میں رہنا پڑتا تھا، مگر اس مرتبہ کی جدائی ابدی تھی۔ مولانا 3 اگست 1942 کو ممبئی کے لیے روانہ ہوئے تھے اور پھر زلیخا بیگم کی زندگی میں لوٹ کر نہیں آئے۔

مولانا آزاد نے کلکتہ سے اس سفر کے لیے اپنی روانگی اور رفیقۂ حیات سے ابدی جدائی کا نقشہ اپنی شاہکار ادبی تصنیف ''غبار خاطر'' میں کھینچا ہے۔ یہ کتاب مولانا نے قلعہ احمد نگر میں اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام خطوط کی شکل میں لکھی۔ زلیخا بیگم کا انتقال 9 اپریل 43 کو ہوا۔ مولانا نے 11 اپریل 43 کو ''صدیق مکرم'' کے نام جو خط تحریر کیا اس میں اپنے سوز دل کا حال یوں بیان کیا ہے:

''میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ 1941 میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کا گزرا تھا۔ مجھے قید خانے میں اس کے خطوط ملتے رہے، ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آ رہی تھی۔ اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

''جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتے کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور

پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی تھی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کرلیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کے غیر معمولی حالات نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کرلیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے تھے، اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے، اس لیے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہیں تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ 3 اگست کو جب میں بمبئی روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو 13 اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

''گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی! میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔''

مولانا آزاد انگریزوں کی قید سے رہا ہوکر تین سال بعد گھر واپس آگئے مگر اب اس گھر میں زلیخا نہیں تھیں اور گھر ان کے بغیر بالکل خالی خالی تھا اور مولانا کی زندگی میں وہیں سے ایک طویل خلا پیدا ہوگیا۔ زلیخا بیگم دکھ سکھ کی دمساز وفاشعار بیوی تھیں۔ مولانا کی قومی زندگی کانٹوں بھری تھی۔ وطن کی آزادی کی راہ میں مولانا نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا، امیر باپ کے بیٹے تھے مگر اب قلاش ہوگئے تھے۔ گھر میں کبھی کبھی فاقہ کشی تک نوبت پہنچ جاتی۔ بیگم آزاد کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتیں۔ اپنے شوہر کی دینی وقومی خدمات میں ان کا پورا ساتھ دیتیں اور حالات جیسے بھی ہوں صبر وشکر سے برداشت کرتیں۔ مولانا جب اپنی شہرۂ آفاق تفسیر ''ترجمان القرآن'' لکھنے میں مصروف تھے اور راتوں کو جاگتے تھے تو بیگم صاحبہ اپنے عالم دین شوہر کو پنکھا جھلتی رہتیں تاکہ مولانا کا قلم یکسوئی سے چلتا رہے۔ مولانا آزاد قلعہ احمد نگر میں قید تھے۔ گھر میں پیسے کی کمی تھی مگر کسی کا احسان لینا انھیں گوارہ نہیں تھا۔ مولانا کی خودداری اور عزت نفس کی حفاظت زلیخا بیگم نے مرتے دم تک کی۔ مولانا آزاد کے رفیق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب ''ذکر آزاد'' میں بیگم صاحبہ کی وفات کا واقعہ قلم بند کیا ہے۔ مولانا ملیح آبادی کے سامنے بیگم صاحبہ نے آخری ہچکی لی۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''یہ تو معلوم تھا کہ بیگم بیمار ہیں مگر میں عیادت کو نہیں جاتا تھا کیوں کہ مولانا موجود نہ تھے۔ 9 اپریل 1949 کی صبح نو دس بجے فون آیا کہ بیگم صاحبہ تمھیں یاد کر رہی ہیں۔ میں فوراً پہنچ گیا۔ گھر کے اداس نظارے ہی نے سب کچھ بتا دیا۔ مجھ سے کہا گیا، بیگم صاحبہ کے کمرے میں چلو، مجھے تامل ہوا۔ مدتوں ایک ہی گھر میں رہا تھا اور پردہ بھی کانا تھا مگر کبھی اچٹتی نگاہوں سے بھی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میرا پس وپیش دیکھ کر کہا: بیگم صاحبہ مصر ہیں کہ تم پہنچو، وقت آخری ہے دیر نہ کرو۔ مجبوراً جانا پڑا۔ واقعی بیمار کا آخری وقت تھا مگر نہ جانے کہاں سے قوت آگئی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا، کہنے لگیں: ''آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ کی ہمیشہ شکرگزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں ان سے کہنا کہ تمھارے ہی نام پر مر رہی ہوں مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا۔ ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ کہنے لگیں: مولانا کے لیے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ ہچکی آئی، اب وہاں کچھ نہ تھا۔ پلنگ پر صرف ایک لاش باقی تھی۔ (ذکر آزاد)

اسی وفاشعار کی تربت پر ساٹھ سال کے عرصے میں ایک کتبہ نصب ہوا جس سے قبر کی پہچان ہوگئی۔ 19 اے بالی گنج سرکلر روڈ (اب 5 اشرف مستری لین) کا مکان بھی برسوں سے ویران پڑا تھا، جہاں زلیخا بیگم نے آخری سانس لی تھی۔ حکومت مغربی بنگال نے قومی اہمیت کا یہ مکان اکوائر کر کے مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے حوالے کر دیا ہے۔

مولانا آزاد راہ وطن میں ایثار وقربانی میں ایسے لگے کہ اپنا ذاتی گھر کہیں نہیں بنایا، کرائے کے مکانوں میں زندگی کاٹ دی، اب قوم کی طرف سے آزاد اور بیگم آزاد کی یادوں کو بسانے کے لیے وہ تاریخی گھر محفوظ کر دیا گیا ہے جس میں بیگم نے مولانا کو آخری بار خدا حافظ کہا تھا اور آخری سانس لی تھی۔

□□□

پتہ:
A-202, Adeeba Market /Apartments,
Near Rahmani Masjid,
Main Road, Zakir Nagar,
New Delhi-110025

آبگینۂ نظر

ہندوستان کا مستقبل اولین ہے نہ کہ سیاست

ہندوستان کی آزادی کے 62 سال مکمل ہونے کے موقعے پر وزارت فروغ انسانی وسائل کے سربراہ جناب کپل سبل نے 4 اگست 2009 کو ملک کے تمام بچوں کے لیے تعلیمی بل کو منظور کرا کر تعلیم کے تئیں ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

ہندوستان کے آئین کے مطابق ہر ہندوستانی کو تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ آئین کی اسی دفعہ کو سامنے رکھتے ہوئے سپریم کورٹ نے 6 سے 14 سال تک کے عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کے حق میں 16 سال پہلے ہی فیصلہ دے دیا تھا لیکن اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا باقی تھا۔ اس دوران کئی حکومتیں آئیں اور گئیں لیکن یہ مسئلہ اپنی جگہ رہا۔ ہندوستانی آئین کے مطابق سبھی بچوں کو رنگ و نسل، مذہبی، علاقائی اور معاشی تفریق سے ماورا تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔ یہ ہر بچے کا بنیادی حق ہے اور اسی حق کو تسلیم کرتے ہوئے UPA نے اسے منظور کرالیا ہے۔ 4 اگست کو راجیہ سبھا میں 6 سے 14 سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم سے متعلق اس بل کی منظوری ایک تاریخی فیصلہ ہے۔ لوک سبھا میں یہ بل پہلے ہی 20 جولائی کو منظوری حاصل کر چکا ہے۔

جناب کپل سبل نے کہا کہ اس فیصلے سے ملک کے سبھی بچوں کو 21 ویں صدی میں درپیش مسائل کا مقابلہ کرنے کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ہندوستان کے بچے ہمارا سنہرا مستقبل ہیں اور مفت اور لازمی تعلیم کے جائز حق کو اس کے حقداروں تک پہنچانا ایک قومی فریضہ ہے۔ آج کے ہندوستان میں کوئی بھی بچہ تعلیم سے محروم رہ جائے یہ ملک کے حق میں کسی بھی طرح بہتر نہیں ہوگا۔ اس لیے ملک کے ہر بچے کو اسکول جانا چاہیے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ بچوں کو بنیادی تعلیم مفت اور لازمی طور پر فراہم کرانا کوئی آسان کام نہیں ہے اور اس پورے پروجیکٹ پر خرچ کرنے کے لیے ایک خطیر رقم درکار ہے۔ ایوان میں موجود ممبران نے مفت اور لازمی تعلیم پر آنے والے خرچ پر جب تشویش ظاہر کی تو وزیر تعلیم نے ان کی تشویش کو جائز ٹھہراتے ہوئے کہا کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقصد بڑا اور راہیں دشوار ہیں۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ بل پاس ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس لیے اس سلسلے میں انھوں نے National University of Educational Planning and Administration کو ضروری ہدایات دے دی ہیں اور اس نے پورے پروجیکٹ پر آنے والے خرچ سے متعلق مفصل رپورٹ تیار کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔

جناب کپل سبل نے اراکین پارلیمنٹ کو یقین دلایا کہ اس تاریخ ساز فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مرکز اپنی ذمے داریاں، ہر ممکن طریقے سے نبھائے گا۔ اگر کوئی ریاست اپنا خرچ اٹھانے کی حالت میں نہیں ہوگی تو اس ریاست کا معاملہ فائنانس کمیشن کے سامنے رکھا جائے گا اور اسے اضافی رقم مہیا کرائی جائے گی۔

وزیر تعلیم نے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ایوان کے ممبران سے کہا کہ بچوں کی تعلیم کے حق کی حصولیابی کوئی انفرادی ذمے داری نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی ذمے داری ہے جس میں سبھی کو اپنے سیاسی مفاد سے اوپر اٹھ کر باہمی اتفاق کے ساتھ کام کرنا چاہیے، کیونکہ یہ ہندوستان کے مستقبل کا سوال ہے۔

یہ بل کئی کئی انقلابی نوعیت کے فیصلوں کا حامل ہے۔ مثلاً:

- اس قانون کے تحت پرائیوٹ اسکولوں میں Disadvantaged Category کے لیے 25 فیصد سیٹیں مخصوص کر دی گئیں ہیں۔
- بچہ مزدوری، روکنے کے لیے یہ فیصلہ لیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بچے کو اسکول جانے سے روکتا ہے تو اس پر 10 ہزار روپئے کا جرمانہ عائد کیا جائے گا۔
- داخلوں کے وقت، کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جائے گا اور اگر زیادہ فیس دینے والوں کو اسکول مینجمنٹ نے ترجیح دی تو اس کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے گی۔
- کسی بھی بچے کو اس کے کمزور تعلیمی ریکارڈ کی بنیاد پر آگے پڑھنے سے نہیں روکا جائے گا۔
- بچوں کو جسمانی سزا نہیں دی جائے گی۔
- پرائمری اسکولوں میں پہلی سے پانچویں کلاس تک 200 دن (Working Day) ہوں گے اور اعلیٰ پرائمری سطح پر 220 Working Day ہوں گے۔ ایک ہفتے میں کم سے کم 45 گھنٹے ہر استاد کو کام کرنا ہوگا۔
- Infrastructure میں ہر کلاس کا ایک الگ استاد، لڑکیوں اور لڑکوں کے الگ الگ Toilets، پینے کے پانی کی سہولت، معذور بچوں کے لیے Barrier free ماحول دستیاب کرانے کا ذمے دار ہوگا۔
- لیاقت رکھنے والے استادوں کی تقرری ہوگی۔
- ریاستی حکومتیں پڑوسی اسکول (Neighberhood Schools)

اسکول قائم کریں گی تاکہ مفت آمدورفت کی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔

● ایک سال کے اندر اندر ریاستیں اس بات کی تصدیق کریں گی کہ 7 سے 9 سال کی عمر کے کسی اسکول کے Dropout طلبہ پڑوسی اسکولوں میں داخلہ لے چکے ہیں۔

● ریاستوں کو Pre-School تعلیم کے سلسلے میں مؤثر اقدامات اٹھانے ہوں گے۔

● اگر کوئی بچہ یا بچی Elementary تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے تو اسے 18 سال تک مفت تعلیم فراہم کی جانی چاہیے۔

● 14 سال تک کی عمر کے سبھی بچوں کی تعلیم کے اعداد وشمار موجود ہونا چاہیے خاص کر Disadvantaged گروپ کے طلبہ کے۔

● معذور بچوں کے لیے بھی تعلیم کا معقول انتظام ہوگا، جو بچے عام اسکولوں میں داخلہ لے سکتے ہیں انھیں وہاں داخلہ دیا جائے گا جب کہ Special اسکولوں کے قیام پر بھی غور کیا جارہا ہے۔

● اسکولی طلبہ اور طالبات کو ایک خصوصی رعایت کے طور پر ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں داخلہ لینے پر ٹرانسفر سرٹیفیکٹ کی ضرورت نہیں ہوگی۔

● اسکول کی انتظامیہ کمیٹی میں عام لوگوں کی نمائندگی ہوگی۔

● بچوں کے ذہن سے امتحانات کے خوف کو ختم کرنے کے لیے چھٹی سے آٹھویں جماعت تک کے طلبہ کے لیے بورڈ امتحانات کو ختم کردیا گیا ہے۔

تعلیمی بل لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں تو پاس ہوگیا لیکن ابھی آنکھوں کی سوئیاں نکالنی باقی ہیں۔ تعلیم کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ معاشی، ثقافتی، قومی اور بین الاقوامی سبھی طرح کے عوامل اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سماجی اور معاشی دائرے اپنے آپ میں اتنے مضبوط ہیں کہ تعلیم سے متعلق کسی بھی بڑے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان عوامل کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس بل کی منظوری کے ساتھ کئی ایسے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کے جوابات یا حل تلاش کیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔

تعلیم بل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جہاں مرکزی حکومت کمربستہ دکھائی دیتی ہے وہیں دوسری جانب ریاستوں پر مصارف اور متعلقہ ذمے داریوں کو اٹھانے کی بات آتی ہے تو پارلیمنٹ میں موجود سارے چہرے فکرمند نظر آنے لگتے ہیں بلکہ ان کی جانب سے کپل سبل صاحب تک یہ گذارش بھی پہنچ جاتی ہے کہ ہم بل کے منظور ہونے سے خوش تو بہت ہیں لیکن مذکورہ قانون کو عملی جامہ پہنانے میں ہونے والے خرچے کا بوجھ اگر مرکز خود ہی اٹھائے تو بہتر ہوگا۔ ریاستوں کو اس خرچے سے بری الذمہ کردیا جائے۔ اس کی سب سے اہم وجہ غالباً یہ ہے کہ ریاست اور مرکز کے مابین اخراجات کے بابت کوئی واضح معاشی پالیسی طے نہیں ہو پائی ہے۔ بل کے کچھ اہم نکات مثلاً ہمسایہ اسکولوں کی نوعیت الگ الگ ریاستوں میں کیا ہوگی طے نہیں ہو پائے ہیں۔ جن بچوں کی ابتدائی تعلیم تک رسائی نہیں ہے یا پھر 6 سے 14 سال تک کے وہ بچے جو اسکول سے Dropout کر گئے ہیں ان کا ریکارڈ کس طرح فراہم ہوگا اور کس ادارے کے تحت رکھا جائے گا۔

● مفت اور لازمی تعلیم کو بروئے کار لانے کے لیے ہونے والے خرچ کو کس طرح بانٹا جائے گا، استادوں کی تقرری اور ان کی تنخواہوں سے متعلق مشکلات کا ازالہ کس طرح کیا جائے گا؟ ایک طالب علم سیکنڈری اسکول کے بعد یعنی 14 سال کی عمر کے بعد کیا کرے گا؟ اگر تعلیم کا انتظام نہیں ہوگا تو یقیناً مزدوری کرے گا۔

بچوں کی اسکول میں حاضری بڑھے کیا اس سلسلے میں Mid day Meal جیسی اسکیمیں ہی کافی ہیں۔

بل میں Disadvantaged Category کا بھی ذکر ہے، اس Category میں کون کون سے Group شامل ہوسکتے ہیں اس کے متعلق کوئی واضح Categorization نہیں ہے۔ اس میں Minority اور Differently-able طلبہ بھی اگر شامل ہوتے ہیں تو داخلے کی سیٹیں کم اور Enrollment زیادہ ہونے کا مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ غرض یہ کہ عملی میدان میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے سماج میں سماجی مسائل (Social Problems) اتنے زیادہ ہیں کہ کسی بھی نئی پالیسی کو عمل میں لانے سے پہلے ان مسائل سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ غریبی، بے روزگاری، بڑھتی ہوئی آبادی، تعلیم کا گرتا ہوا معیار اور بچوں سے جڑی ان گنت سماجی برائیاں مثلاً بچہ مزدوری، اسکول ڈراپ آؤٹ، جسمانی استحصال Child Trafficking نشہ آور ادویات کی تجارت وغیرہ۔ یہ تمام سماجی برائیاں براہ راست تعلیم کی کمی سے تعلق رکھتی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر کی جانے والی متعدد تحقیقات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ سماجی برائیوں کا حل تعلیم کے فروغ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اور تعلیم کی اسی اہمیت اور افادیت کو سمجھتے ہوئے یہ انقلابی قدم اٹھایا گیا ہے اور اب نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کی نگاہیں اس پر ٹکی ہیں کہ تعلیم میں یہ نئے رجحانات کہاں تک بارآور ہو پاتے ہیں۔

□□□

پتہ:

A-7, Khajoori Road
Batla House, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi-110025

مجتبیٰ حسین

ٹورانٹو میں تین دن

وہ 29 اگست کی خوشگوار صبح تھی جب ہم نیویارک کے جان ایف کینیڈی ہوائی اڈے سے اُڑکر ایرکناڈا کی پہلی پرواز کے ذریعے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر طے کر کے ٹورانٹو پہنچے تھے۔ ایرکناڈا میں سفر کرنے کا ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا۔ دیوہیکل بوئنگ ہوائی جہاز میں زیادہ تر نشستیں خالی تھیں۔ ہم نے سوچا کہ صبح کی اولین ساعتوں میں غالباً مسافروں کو نیند سے بیدار ہونے میں تامّل رہا ہوگا اسی لیے نشستیں خالی ہیں۔ یوں بھی ہر کوئی اردو کا ادیب تھوڑا ہی ہوتا ہے جسے اول تو نیند نہیں آتی اور اگر آتی بھی ہے تو اسے کسی بھی وقت جگا دیا جا سکتا ہے۔ پچھلے دو مہینوں کے عرصے میں بیسوں امریکی ایرلائنوں کے ہوائی جہازوں میں مسافروں کی بھیڑ کو دیکھ کر ہمیں ہمیشہ گولی گوڑہ بس ڈپو کی یاد آتی رہی ہے۔ ہوائی جہاز کی خانہ ویرانی کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے ہمیں گمان ہوا کہ کیا عجب کہ اس میں پائلٹ بھی نہ ہو۔ اس گمان کے پیدا ہوتے ہی گھبراہٹ میں محض طمانیت قلب کی خاطر ہم پائلٹ کے کیبن میں ملحقہ ٹائلٹ میں گئے اور کیبن کی دراز میں سے جھانکا تو وہاں سچ مچ ایک پائلٹ کو موجود پایا۔ اندھا کیا چاہے ایک لاٹھی اور مسافر کیا چاہے ایک پائلٹ۔ بالآخر ڈرتے ڈرتے ٹورانٹو کے ہوائی اڈے پر اترے تو دیکھا کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ ہوائی اڈے سے باہر نکلنے لگے تو دکھائی دیا کہ برآمدے کے شیشے کے پیچھے سے ایک ہاتھ ہمارے لیے ہل رہا ہے۔ باہر آئے تو دو اصحاب کو منتظر پایا۔ ایک صاحب، جو گہرے نیلے رنگ کے دھاری دار سفاری سوٹ میں ملبوس تھے، بڑی گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوئے اور وفورِ جذبات میں ان کی بغل گیری تادیر جاری رہی تو ہمیں یاد آیا کہ یقیناً اس دھاری دار سفاری سوٹ سے ہماری بڑی پرانی شناسائی ہے۔ انھوں نے چھوٹتے ہی کہا" میں منیم ہوں۔" بغل گیری کے وقت چونکہ ان کا منہ دوسرے طرف تھا لہٰذا تھوڑی دیر میں ہم نے سوچا کہ ناظم الدین مقبول غالباً تقریب کے انتظامات میں مصروف ہوں گے۔ اسی لیے اپنے "منیم جی" کو ہمارے استقبال کے لیے بھیجا ہے۔ اس پر ہم نے کہا: "اچھا تو آپ ناظم الدین کے "منیم" ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کناڈا میں اب بھی "منیموں" کو ملازم رکھنے کا رواج عام ہے۔ اگرچہ ہماری آپ سے یہ پہلی ملاقات ہے لیکن یاد پڑتا ہے کہ آپ کے دھاری دار سفاری سوٹ سے ماضی میں پہلے کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ کیا یہ آپ کا اپنا سفاری سوٹ ہے یا کسی اور کا ہے؟" اتنا سنتے ہی موصوف نے بغل گیری سے فوراً دست برداری اختیار کی اور کہا: "مجتبیٰ بھائی! میں منعم ہوں منعم یعنی م۔ن۔ع۔م۔ ناظم الدین اور دولت رام کا پرانا دوست ہوں۔ دس برس پہلے بھی اسی سفاری سوٹ کے ساتھ آپ سے فتح میدان کلب میں ملاقات ہوئی تھی۔ حیدرآباد میں ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرتا تھا۔ اب کناڈا میں رہتا ہوں۔ آپ کے دوست محمد میاں کی ٹائروں کی دکان پر بھی آپ سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی۔ جہاں میں اپنی گاڑیوں کے ٹائر خریدنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ آپ کی وجہ سے وہ مجھے ٹائر بھی ادھار دے دیا کرتے تھے بلکہ دو ٹائروں کے دام بھی اب بھی مجھ پہ واجب الادا ہیں۔ میں ہمیشہ گہرے نیلے رنگ کے دھاری دار کپڑے یا سوٹ پہنا کرتا تھا اور اسی مناسبت سے آپ مجھے "زیبرا" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ میں نے آج یہ سوٹ صرف اس لیے پہنا تھا کہ آپ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائیں۔ افسوس کہ آپ نے سوٹ کو پہچان لیا لیکن مجھے نہیں پہچانا۔" ہمیں پچھلی ساری باتیں یاد آئیں تو ہم نے منعم شریف کو پھر ایک بار گلے لگاتے ہوئے ہنس کر کہا: "میاں منعم! آدمی کا لباس اس کی اپنی شخصیت کے مقابلے میں زیادہ قیمتی نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ لباس نمایاں ہو جاتا ہے اور اس میں ملبوس آدمی پس پشت چلا جاتا ہے۔ تمھاری شناخت تمھاری اپنی ذات سے ہونی چاہیے تمھارے لباس سے نہیں۔" ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ناظم الدین مقبول اپنی گاڑی لے کر آ گئے کیونکہ ہمیں دیکھتے ہی وہ اپنی گاڑی لانے کے لیے چلے گئے تھے۔ بڑے شہروں کی زندگی اور ٹریفک میں اتنی فرصت ہی کہاں کہ آدمی جی بھر کے بغل گیر ہو اور سرِ عام اپنی محبتیں نچھاور کرنا شروع کر دے۔ ناظم الدین مقبول بہت زیادہ نہیں بدلے۔ البتہ ان کے بالوں میں چاندی بکھرنے لگی ہے۔ ٹورانٹو کے تین دنوں کے قیام میں ناظم الدین اور منعم شریف سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہے۔ اور ان کے اس ساتھ کو ہم کبھی بھلا نہ پائیں گے۔ ہمارا قیام ٹورانٹو کے مضافاتی علاقے مسی ساگا کے ایک خوبصورت اور آرام دہ ہوٹل میں تھا۔ ناظم الدین نے بتایا کہ دوپہر میں ہمیں ویژن آف پاکستانی، نامی ٹیلی ویژن کے دفتر میں جانا ہے جہاں ٹی.وی کی مشہور شخصیت بشیر خاں ہمارا انٹرویو کریں گے۔ یہ مقبول عام پروگرام پچھلے 35 برسوں سے جاری ہے۔ وہ جمعہ کا دن تھا اور بشیر خاں کا دفتر اسلامک آف نارتھ امریکا (ISNA) کی جامع مسجد کے احاطے میں واقع ہے۔ چنانچہ ہر جمعہ کی نماز سے پہلے ہی ان کے دفتر پہنچ گئے۔ سینکڑوں موٹریں جامع مسجد کے احاطے میں ٹھہری ہوئی تھیں اور ان کے ٹھہرائے جانے کا سلسلہ جاری

تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ نمازیوں اور موٹروں کی آئے دن بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر جمعہ کی نماز وقفہ وقفہ سے دو وقتوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ پہلی جماعت اور دوسری جماعت کے نمازیوں اور ان کی گاڑیوں کے لیے علی الترتیب مسجد میں مصلے اور پارکنگ میں جگہیں مختص ہوتی ہیں۔ جس سلیقے سے ہزاروں گاڑیاں پارکنگ ایریا میں ٹھہری ہوئی تھیں انھیں دیکھ کر ہم نے ناظم الدین سے کہا "میاں مقبول! جس سلیقہ اور اہتمام سے نمازیوں کی انواع و اقسام کی گاڑیاں اپنی اپنی صفوں میں کھڑی ہیں انھیں دیکھ کر احساس ہو رہا ہے کہ ہمارے محمود ایاز یعنی سارے نمازی بھی اسی نظم وضبط کے ساتھ اپنی اپنی صفوں میں کیوں نہیں کھڑے ہوتے۔ بیچارے امام کو ہمیشہ کہنا پڑتا ہے۔ حضرات! اپنی اپنی صفیں سیدھی کر لیجیے۔" مقبول نے ہنس کر کہا "آپ سے مشکل یہ ہے کہ آپ ہر چیز کا مشاہدہ اپنے طنزیہ زاویۂ نگاہ سے کرنا چاہتے ہیں۔"

بہر حال نماز کی پہلی جماعت کے بعد بشیر خاں نے نہایت دلچسپ اور بے تکلف انداز میں ہماری بات چیت ریکارڈ کی۔ ریکارڈنگ کے بعد ہم ناظم الدین کے ہمراہ اپنے دوست بیدار بخت اور اپنے حیدرآبادی دوست شبیر علی خاں سے ملنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں ہم نے تیزی سے بدلتے ہوئے ٹورانٹو کو بصد اشتیاق دیکھا۔ وسیع وعریض شاہراہیں، خوبصورت رہائشی علاقے، دلنشین سبزہ زار اور بلند و بالا عمارتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ شہر اب نہ صرف بدل گیا ہے بلکہ دور دور تک پھیل بھی گیا ہے۔ کناڈا کی صفائی ستھرائی کے تو ہم پہلے سے قائل ہیں۔ بیدار بخت اپنے گھر پر ہمارے منتظر تھے۔ 1984 میں جب ہم ان کے گھر آئے تھے تو یہ گھر اس وقت نیا نیا بنا تھا بلکہ کچھ حصہ تو بن بھی رہا تھا۔ بیدار بخت کو کتابیں جمع کرنے کا جنون ہے اور ان کی لائبریری میں کئی زبانوں کی نادر اور نایاب کتابیں موجود ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان بیش بہا کتابوں کو اب ٹورانٹو یونیورسٹی کی لائبریری نے حاصل کر لیا ہے۔ ہمارے پہلے دن کی شام ہونے لگی تھی لہٰذا ہم لوگوں نے ایک پاکستانی ریستوران میں کھانا کھایا اور ہوٹل چلے آئے۔ یوں بھی دوسرے دن وہ تقریب ہونے والی تھی جس کے لیے ہم ٹورانٹو بلائے گئے تھے۔ دن بھر آرام کرنے کا پروگرام تھا۔ دوپہر میں ازراہ عنایت اشفاق حسین ملنے کے لیے آ گئے۔ اشفاق حسین نے ادبی اور تہذیبی سطح پر کناڈا میں اردو کے لیے جو کام کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ ایک عرصہ تک وہ کناڈا سے "اردو انٹرنیشنل" کے نام سے ایک نہایت معیاری رسالہ بھی شائع کیا کرتے تھے۔ فیض احمد فیض پر ان کا کام دستاویزی حیثیت کا حامل ہے جسے ساری اردو دنیا میں سراہا گیا۔ ٹورانٹو میں انھوں نے کئی عظیم الشان مشاعرے بھی منعقد کیے جن میں ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر شعرا نے شرکت کی۔ بات چیت کے دوران انھوں نے مشاعروں کے تعلق سے پتے کی بات یہ کہی کہ ایک زمانہ میں ہمارے درمیان ایسے شعرا موجود تھے جو ادب میں بھی مقبول تھے اور مشاعروں کے بھی مقبول شاعر تھے مگر اب رفتہ رفتہ مشاعروں کے شاعر اور شاعری کے شاعروں کے درمیان ایک خلیج سی پیدا ہو گئی ہے۔ اب مشاعروں میں ترنم سے کلام سنانے والوں میں اچھل کود کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے مشاعروں کی تفریحی حیثیت میں تو ضرور اضافہ ہوا ہے لیکن ان کی ادبی حیثیت پس پشت چلی گئی ہے۔

30 اگست کو شام میں مسی ساگا کے کمیونٹی سنٹر کے وسیع وعریض ایل.بی ٹیلر آڈیٹوریم میں وہ تقریب منعقد ہوئی جس کے لیے ہم ٹورانٹو آئے تھے۔ دوسرے دن سے رمضان کے شروع ہونے کا امکان تھا۔ امریکا اور کناڈا میں رمضان کا مہینہ جس جوش وخروش کے ساتھ آتا ہے اس کا اندازہ ہمیں یہاں آنے کے بعد ہی ہوا۔ منتظمین کو یہ ڈر تھا کہ اگر دوسرے دن پہلے روزے کا اعلان ہو جاتا ہے تو شاید سامعین زیادہ نہ آ سکیں مگر چاند نے بھی منتظمین کا ساتھ دیا اور جب تقریب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی تو دیکھا کہ 450 نشستوں والے آڈیٹوریم کی ساری نشستیں نہ صرف پُر ہو چکی تھیں بلکہ بعض سامعین راہداریوں میں کھڑے ہونے پر مجبور تھے۔ بزم احباب کناڈا کی جانب سے اپنے ہی سلسلے میں منعقد ہونے والی اس تقریب کا حال اپنے ہی قلم سے لکھنا اچھا نہیں لگتا۔ اس میں بھی وہی ہوا جو اکثر ہوتا ہے یعنی ہماری تعریف، توصیف۔ لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ اس میں ہمارے زمانہ طالب علمی کے دو پرانے دوستوں یعنی یوسف امتیاز اور رضاء الجبار کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی جس کی وجہ سے سامعین کو ہماری اصلیت کو جاننے کا موقع بھی ملا۔ پچھلے دو مہینوں میں ہم نے کئی محفلوں میں شرکت کی ہے لیکن یہ اپنی نوعیت کی ایک یادگار تقریب تھی۔ باذوق سامعین کی سخن فہمی نے محفل کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور ہمیں اندازہ ہوا کہ کناڈا میں اردو شعر و ادب کا ماحول کتنا توانا اور مستحکم ہے۔ حیدرآبادی اہل سخن کے علاوہ پاکستانی ادب دوستوں کی بھی کثیر تعداد شریک تھی۔ ہمارے حیدرآبادی دوست سعادت علی خاں نہ صرف حیدرآبادی شیروانی میں ملبوس تھے بلکہ پرانے زمانے کی حیدرآبادی رومی ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔ اب یہ ٹوپی حیدرآباد میں بھی نہیں دکھائی دیتی۔ یوں بھی ایسی ٹوپی اب کناڈا کے شہریوں کو ہی زیب دیتی ہے کیونکہ شمالی امریکا کے نقشے کو دیکھیے تو احساس ہوتا ہے کہ خود کناڈا کی حیثیت اب شمالی امریکا کے سر پر رومی ٹوپی کی سی ہو گئی ہے۔ جمال زبیری نے محفل کی صدارت کی اور ناظم الدین مقبول نے لفظوں کی فضول خرچی کیے بغیر پُر لطف انداز میں محفل کی کارروائی چلائی۔ اشفاق حسین نے بھی اس سائٹ "شعروسخن" کے سربراہ سردار علی نے (جن کا تعلق حیدرآباد سے

ہے) ہمیں انعامات سے نوازا۔ رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق قادری نے اپنی اور حکومت کناڈا کی جانب سے ایک اعزازی سند روانہ کی جسے ان کے والد جناب جمال قادری نے پیش کیا۔ ممتاز عثمانین سید شاہ بلیغ الدین کے علاوہ ہندوستانی نژاد مسلمانوں کی تنظیم ''اِملی'' کے سرگرم کارکن اور ہمارے نوجوان دوست ایوب علی خاں نے بھی اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ محفل میں شرکت کی۔ جس خلوص دل اور تندہی کے ساتھ ناظم الدین مقبول اور ان کے دوستوں آصف مسعود جامعی، وصاف الرب، محمد عالم، محبوب شریف منعم نے یہ محفل آراستہ کی اس سے اندازہ ہوا کہ ناظم الدین مقبول نہ صرف ایک بہترین ناظم ہیں بلکہ ٹورانٹو میں مقبول بھی ہیں۔ یوں بھی وہ اردو کا ایک نہایت مقبول عام ریڈیو پروگرام پیش کرنے کے علاوہ اپنے صرفہ سے ہر اتوار کو دن میں گیارہ بجے سے دو بجے تک اردو کی مفت تعلیم کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔ تیسرے دن ہم نے ٹورانٹو کے ڈاون ٹاون کی سیر کرنے کے علاوہ اس علاقے کی بھی سیر کی جہاں زیادہ تر ہندوستانی اور پاکستانی تارکان وطن آباد ہیں۔ اردو کے سائن بورڈ بھی نظر آئے۔ شام کو ہم نیو یارک کے لیے روانہ ہوئے تو ناظم الدین اور محبوب شریف منعم نے بادیدۂ نم ہمیں وداع کیا۔ ایک لمحہ کے لیے ہمارے دل میں خیال آیا کہ ناظم الدین مقبول کی محبت کا آتش فشاں اب شائد پھر بیس برس بعد ہی پھٹے گا۔ خیر اس وقت تک تو ہم لالہ و گل میں نمایاں ہو چکے ہوں گے۔ رہے نام اللہ کا۔

□□□

پتہ:
502-Mabahar Regency,
A-C, Guards, Hyderabad-500004

कौमी काउन्सिल बराए-फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of HRD, Dept. of Higher Education, Govt. of India
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066
Ph. 26109746, 26169416 Fax: 26108159
E-mail: urdueducation@hclinfinet.com

کتابوں کی دستیابی
آپ کے شہر آپ کے گاؤں

موبائل وین سے اردو کتابوں کی نمائش و فروخت کے تجربے میں ہمارے اردو قارئین نے جس جوش و خروش سے کتابیں خریدیں اور کتب بینی کی روایت میں نئی روح پھونکی اس نے کونسل کے ولولے دوبالا کیے ہیں۔ اتر پردیش کی دور دراز اردو بستیوں میں آپ کے ہاتھوں تک اردو کا سرمایہ پہنچانے کے لیے یہ موبائل وین اب حسب ذیل پروگرام کے مطابق آپ کی بستی میں پہنچے گی۔

22 تا 23 اگست	سیتاپور	3 تا 4 ستمبر	اکبر پور
24 تا 25 اگست	بہرائچ	5 تا 6 ستمبر	سلطان پور
26 تا 27 اگست	گونڈا	7 تا 9 ستمبر	اعظم گڑھ
28 تا 29 اگست	فیض آباد	10 تا 12 ستمبر	مئو
30 تا 31 اگست	بستی	13 تا 14 ستمبر	غازی پور
1 تا 2 ستمبر	ٹانڈا	15 تا 16 ستمبر	جونپور

انتخاب کلام

میر جعفر علی (1065ھ۔1125ھ) ولد سید عباس نارنولی۔ ان کے والد کا انتقال ان کے بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ اپنے چچا میر سرور کی نگرانی میں تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی، پھر تلاش ملازمت میں نکل کھڑے ہوئے۔ اورنگ زیب کے بیٹے کام بخش کی فوج میں نوکر ہوگئے اور اس سلسلے میں عرصے تک حیدرآباد دکن میں مقیم رہے۔ یہ عہد عالم گیر کے دور آخر کے نامی گرامی ہزال تھے۔ ان کا کلام مسخرگی سے پُر ہے اور خود ان کے بقول ''کوزہ و کرکٹ است'' لیکن اس سے زبان کی حالت کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ فارسی اور ہندی کی آمیزش کیا کیا صورتیں اختیار کررہی تھی۔ لطیفے ان کے مشہور ہیں۔ ان کے کلیات میں انواع و اقسام کی ظرافت ملتی ہے۔ رقعات نثر، عدالتی تحریریں، شرارت نامہ، مصطلحات زمانہ ان کی نثری تحریریں ہیں۔ حصۂ نظم میں ہجو، رقعات، دستور العمل، پندونصائح، رجز، نسخہ جات مسکلے، غزلیات مورچھل نامہ، کچہری نامہ، ظفرنامہ، مراثی، قطعات اردو فارسی بھی کچھ ہیں اور ہر ایک اپنے رنگ میں خوب ہے۔

جب حیدرآباد میں شہزادہ کام بخش کے نوکر تھے، کسی بات پر خفا ہوگئے، ہجو لکھی، نکالے گئے۔ دکن سے بھاگے، راستے میں جو تکالیف اٹھائیں ان کا ذکر یوں کرتے ہیں:

تنہا شدی اندر سفر، کہہ جعفر اب کیسی بنی
افتادی اندر بحر و بر کہہ جعفر اب کیسی بنی
از ہجو آں سلطان خود، کردی پریشاں حال خود
درماندۂ بے بال و پر کہہ جعفر اب کیسی بنی
اسباب غم برداشتی، تخم فلاکت کاشتی
اکنوں کجا آں سیم و زر کہہ جعفر اب کیسی بنی

ایک دفعہ گھر میں چوری ہوگئی اور کچھ بھی باقی نہ رہا۔ غصے میں شعر کہے:

دلا در مفلسی، سب سے اکڑ رہ   بہ عالم بے کسی سب سے اکڑ رہ
چکن اور زر کا چیرہ پشم کر بوجھ   پھٹی پگ باندھ کر سب سے اکڑ رہ
اگر شلوار نباشد کس کو غم ہے   لنگوٹا باندھ کر سب سے اکڑ رہ
نہ کر خواہش تو جامہ بافتی کا   کہن و گلہ پہن سب سے اکڑ رہ
جو کچھ بھی ہاتھ لاگا چھپ چھپا کر   خوشی ہو ڈنڈ کر سب سے اکڑ رہ
اگر یہ بھی میسر جو نہ ہووے   اکیلا جوں الف، سب سے اکڑ رہ

عالم گیر کی فتح دکن پر ''ظفرنامہ'' لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

زہے شاہ اورنگ دھانک بلی   کہ در ملک دکھن پڑی کھلبلی
برآورد عسکر بہ صد دھوم دھام   کہ اچھل پڑی برسر روم و شام
دریں پیرسالی و ضعف بدن   مچائی دھا چوکڑی در دکن
زہے شاہ شاہاں کہ وقت دغا   نہ ہلدنہ تلد نہ جنبد زجا
کمربستہ ہشیار میدان پر   شب و روز تیار گھمسان پر

ایک شہرآشوب بھی لکھا ہے:

گیا اخلاص عالم سے عجب کچھ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب کچھ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب کچھ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب کچھ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی، چہ بیگانہ چہ زن گھر کی
بھلا دی بات سب ہر کی عجب کچھ دور آیا ہے

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ جب اعظم شاہ تخت نشین ہوئے تو دیگر شعرا کے ساتھ زٹلی نے بھی سکہ نظم کیا اور وہ نہ صرف بادشاہ کو پسند آیا بلکہ خاص و عام کو بھی پسند آیا۔ انعام میں خلعت فاخرہ، ہاتھی اور ایک لاکھ روپے ملے۔ لیکن گھر پہنچنے سے پہلے تمام روپے راستے ہی میں خیرات کردیے۔ سکہ یہ تھا:

نگین سلیماں کہ تابندہ بود
ہمیں اسم اعظم بر آں کندہ بود

جب کسی امیر کے یہاں جاتے دو پرچے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اگر وہ ان سے بہ ملائمت پیش آتا تو اس کی تعریف کرتے، اگر ٹھیک طریقے سے پیش نہ آتا تو فوراً ہجو سنا دیتے۔

فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے اور دونوں کو اس خوش اسلوبی سے سموتے ہیں کہ جوڑ نہیں معلوم ہوتا اور اس زمانے کی زبان کا اندازہ جتنا ان کے کلام سے ہوسکتا ہے، اتنا غالباً کسی دوسرے شاعر کے کلام سے نہ ہوسکے گا۔ تاریخ وفات 1125ھ ہے۔ بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ فرخ میر کی حکومت پر چوٹ کی تھی:

سکہ زد برگندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ دانہ کش فرخ سیر

اس نے مروادیا۔

□□□

میر امّن دہلوی

سیر پہلے دَرویش کی

پہلا درویش دوزانو ہو بیٹھا اور اپنی سَیر کا قِصّہ اس طرح سے کہنے لگا: یا معبوذ اللہ! ذرا ادھر متوجہ ہو اور ماجرا اس بے سروپا کا سنو۔

یہ سرگذشت میری ذرا کان دھر سنو!
مجھ کو فلک نے کردیا زیر و زبر، سنو!
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شِدّت مرے تئیں
اُس کا بیان کرتا ہوں، تم سر بہ سر سنو!

اے یاراں! میری پیدائش اور وطن بُزرگوں کا مُلکِ یمن ہے۔ والد اس عاجز کا مَلِکُ التّجار خواجہ احمد نام، بڑا سوداگر تھا۔ اُس وقت میں کوئی مہاجن یا بیپاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں، اور گُماشتے خرید و فروخت کے واسطے مُقرر تھے اور لاکھوں روپے نقد اور جنس مُلک مُلک کی گھر میں موجود تھی۔ اُن کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر جو کفنی، سیلی پہنے ہوئے مُرشدوں کی حضوری میں حاضر اور بولتا ہے؛ دوسری ایک بہن، جس کو قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی اور شہر کے سوداگر بچّے سے شادی کردی تھی، وہ اپنی سُسرال میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو، اُ کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے! مجھ فقیر نے بڑے چاو چوز سے ماباپ کے سایے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب وفن، سَوداگری کا بہی کھاتا، روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزری، کچھ دنیا کا اندیشہ دِل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے اِلٰہی سے مرگئے۔

عجب طرح کا غم ہوا، جس کا بیان نہیں کرسکتا۔ ایک بارگی یتیم ہوگیا۔ کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اِس مُصیبتِ ناگہانی سے رات دن رویا کرتا، کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کرکٹے۔ چہلُم میں اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا: دُنیا میں سب کے ماباپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو، اپنے گھر کو دیکھو۔ اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے۔ اپنے کاروبار، لین دین سے ہشیار رہو۔ تسلّی دے کردو رُخصت ہوئے۔ گُماشتے، کاروباری، نوکر چاکر جتنے تھے، آن کر حاضر ہوئے، نذریں دیں اور بولے: کوٹھے نقد وجنس کے، اپنی نظرِ مبارک سے دیکھ لیجے۔ ایک بارگی جو اُس دولتِ بے انتہا پر نِگاہ پڑی، آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کو حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت، پردے، چلونیں تکلّف کی لگا دیں۔ اور اچھے اچھے خدمت گار دیدار و نوکر رکھے، سرکار سے زَرق بَرق کی پوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غُنڈے، پھانکڑے، مفت پر کھانے پینے والے، جھوٹے، خوشامدی، آکر آشنا ہوئے اور مُصاحِب بنے؛ اُن سے آٹھ پہر صُحبت رہنے لگی۔ ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں واہی تباہی اِدھر اُدھر کی کرتے اور کہتے: اس جوانی کے عالم میں کیتکی کی شراب یا گُلِ گُلاب کھنچوائیے، نازنیں معشوقوں کو بلوا کر ان کے ساتھ پیجیے اور عیش کیجیے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے؛ ہردم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب، ناچ اور جُوے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نَوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی، جو جس کے ہاتھ پڑا، الگ کیا، گویا لوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیا خرچ ہوتا ہے، کہاں سے آتا اور کیدھر جاتا ہے۔ مالِ مُفت دِلِ بے رحم۔ اس ذرخرچی کے آگے اگر گنجِ قاروں کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا (جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چچہ بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نِثار کرتے تھے) کافور ہوگئے، بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہوجاتی تو آنکھیں چُرا کر مُنہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، ذِهلَیت، خاص بردار، ثابت خانی، سب چھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے: یہ کیا تمھارا حال ہوا؟ سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔

اب دَمڑی کی ٹھڈِیاں مُیَسّر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑا کے کھینچے، تاب بھوکھ کی نہ لا سکا۔ لاچار بے حیائی کا بُرقع مُنہ پر ڈال کر یہ قصد کیا بہن کے پاس چلیے لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سُلوک کیا نہ خالی خط لکھا بلکہ اُس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اِشتیاق کے جو لکھے، اُن کا بھی جواب اس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا۔ اس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا، پر سوائے اُس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں پا پیادہ خالی ہاتھ، گرتا پڑتا ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر، ہمشیر کے شہر میں جاکر اُس کے مکان پر پہنچا۔

وہ ماجائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی؛ تیل ماش اور کالے ٹکے مجھ پر سے صدقے کیے، کہنے لگی: اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بھیا! تیری یہ کیا صورت بنی؟ اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا

کر حمام میں بھیجا۔ نہادھوکر دو کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرّر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات، حلوا سوہن، پستہ، مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے خشک وتر، پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاو، نان، قلیے، کباب تحفہ تحفہ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطرداری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا، خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجالایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے کہ پانو اُس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن (جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی) کہنے لگی: اے بیرن تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماباپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا؛ لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے، گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہوکر گھر سیتا ہے، اُس کو دُنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوص اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے: اپنے باپ کی دولتِ دُنیا کھوکھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمھاری ہنسائی اور ماباپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔

یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی، اُس کی نصیحت پسند کی، جواب دیا: اچھا! اب تم ماں کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں۔ یہ میری مرضی پاکر گھر میں جاکے پچاس توڑے اشرفی کے اصیل اور لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی: ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے۔ تم ان روپیوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایمان دار کے حوالے کرکے دست آویز پکّی لکھوالو اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو۔ اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجو، یا آپ بیچیو۔ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر کرایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت خواند سے خاطر جمع کرلی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہوکر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی تیاری کی۔ جب رُخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سرے پاد بھاری اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان ایک خاص دان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیا میرے بازو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر، آنسو پی کر بولی: سدھارو! تمھیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا مُنہ دکھائیو۔ میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا: تمھارا بھی اللہ حافظ ہے، میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسا کرکے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

غرض جب شہر کے دروازے پر گیا، بہت رات جاچکی تھی، دربان اور نگاہ بانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منت کی: مسافر ہوں، دور سے دھاوا مارے آتا ہوں؛ اگر کواڑ کھول دو، شہر میں جاکر دانے گھاس کا آرام پاؤں۔ اندر سے گھُرک کر بولے: اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں، کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟ جب میں نے جوابِ صاف اُن سے سُنا، شہر پناہ کی دیوار کے تلے، گھوڑے پر سے اُتر، زین پوش بچھا کر بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہوئی، سُنسان ہوگیا: دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر اس اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے! شاید خدا نے میری حیرانی و سرگردانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا، ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔ لالچ سے اُسے کھولا۔ ایک معشوق خوب صورت، کامنی سی عورت، جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے؛ گھائل، لہو میں تر بہ تر، آنکھیں بند کیے پڑی کلبلاتی ہے؛ آہستہ آہستہ ہونٹھ ہلتے ہیں اور یہ آواز مُنہ سے نکلتی ہے: اے کم بخت بے وفا! اے ظالمِ پُر جفا! بدلا اُس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تو نے کیا؟ بھلا ایک زخم اور بھی لگا! میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا۔ یہ کہہ کر اُسی بے ہوشی کے عالم میں دوپٹے کا آنچل مُنہ پر لے لیا، میری طرف دھیان نہ کیا۔

فقیر اُس کو دیکھ کر اور یہ بات سن کر سُن ہوا۔ جی میں آیا، کس بے حیا ظالم نے کیوں ایسے نازنیں صنم کو زخمی کیا؟ کیا اُس کے دل میں آیا اور ہاتھ اس پر کیوں کر چلایا؟ اس کے دل میں تو محبت اب تلک باقی ہے جو اس جاں کندنی کی حالت میں اُس کو یاد کرتی ہے۔ میں آپ ہی آپ یہ کہہ رہا تھا، آواز اُس کے کان میں گئی؛ ایک مرتبہ کپڑا منہ سے سرکا مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اُس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں، مجھے غش آنے اور جی سنسنانے لگا۔ بہ زور اپنے تئیں تھانبا، جرأت کرکے پوچھا: سچ کہو تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو تو میرے دل کو تسلی ہو۔ یہ سُن کر اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی۔ آہستے سے کہا: شکر ہے! میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہورہی ہے، کیا خاک بولوں! کوئی دم کی مہمان ہوں۔ جب میری جان نکل جاوے تو خدا کے واسطے جواں مردی کرکے مجھ بد بخت کو اسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجو، تو میں بھلے برے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخلِ ثواب کے ہو۔ اِتنا بول کر چپ ہوئی۔

رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہوسکی۔ وہ صندوق اپنے پاس اُٹھا لایا اور گھڑیاں گننے لگا کہ کب اتنی رات تمام ہو تو فجر کر شہر میں جاکر جو کچھ علاج اس کا ہوسکے، بہ مقدور اپنے کروں۔ وہ تھوڑی سی رات ایسی پہاڑ ہوگئی کہ دل گھبرا گیا۔ بارے خدا خدا کرکے صبح جب نزدیک ہوئی، مُرغ بولا، آدمیوں کی آواز آنے

گئی؛ میں نے فجر کی نماز پڑھ کر صندوق کو مزدوری میں کسا۔ جوں ہی دروازہ شہر کا کھلا، میں شہر میں داخل ہوا۔ ہر ایک آدمی اور دُکان دار سے حویلی کرایے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک مکان خوش قطع، نیا، فراغت کا بھاڑے لے کر جا اُترا۔ پہلے اُس معشوق کو صندوق سے نکال کر روئی کے پہلوں پر ملائم بچھونا کر کے ایک گوشے میں لٹایا اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر، جرّاح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں جرّاح کاریگر کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ ایک شخص نے کہا: ایک حجام جرّاحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں یکتا ہے اور اس کام میں نپٹ پکّا ہے۔ اگر مُردے کو اُس پاس لے جاؤ، خدا کے حکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اُٹھے۔ وہ اُس محلّے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔

میں یہ مژدہ سُن کر بے اختیار چلا اٹھا۔ تلاش کرتے کرتے پتے سے اُس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مردِ سفید ریش کو دہلیز پر بیٹھے دیکھا اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لیے کچھ پیس پاس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے ادب سے سلام کیا اور کہا: میں تمھارا نام اور خوبیاں سُن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے مُلک سے تجارت کے لیے چلا، قبیلے کو بہ سبب محبت کے ساتھ لیا۔ جب نزدیک اس شہر کے آیا، تھوڑی سے دور رہا تھا جو شام پڑ گئی۔ اَن دیکھے مُلک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا، میدان میں ایک درخت کے تلے اُتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکا آیا، جو کچھ مال اسباب پایا لوٹ لیا۔ گہنے کے لالچ سے اُس بی بی کو بھی گھائل کیا۔ مجھ سے کچھ نہ ہوسکا۔ رات جو باقی تھی۔ جوں توں کر کاٹی، فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرایے لیا۔ ان کو وہاں رکھ کر میں تمھارے پاس دوڑ آیا ہوں۔ خدا نے تمھیں یہ کمال دیا ہے، اس مُسافر پر مہربانی کرو، غریب خانے تشریف لے چلو، اُس کو دیکھو؛ اگر اس کی زندگی ہوئی تو تمھیں بڑا جس ہوگا اور میں ساری عمر غلامی کروں گا۔ عیسیٰ جرّاح بہت رحم دل اور خدا پرست تھا، میری غریبی کی باتوں پر ترس کھا کر میرے ساتھ اُس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلی کی، بولا کہ خدا کے کرم سے اس بی بی کے زخم چالیس دن میں بھر آویں گے، غسلِ شفا کا کروادوں گا۔

غرض اُس مردِ خدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھو دھا کر صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے، اُنھیں سیا۔ باقی گھاؤں پر اپنے کھیسے سے ایک ڈبیا نکال کر کتنوں میں بتی رکھی اور کتنوں پر پھائے چڑھا کر پٹی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا: میں دونوں وقت آیا کروں گا، تو خبردار رہیو، ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مُرغ کا شوربا بجائے غذا اِس کے حلق میں چوائیو اور اکثر عرقِ بید مُشک گلاب کے ساتھ دیا کیجو جو قوت رہے۔ یہ کہہ کر رخصت چاہی۔ میں نے بہت منت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا: تمھاری تشفّی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی، نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ خدا تمھیں سلامت رکھے۔ عطر پان دے کر رخصت کیا۔ میں رات دن خدمت میں اُس پری کی حاضر رہتا، آرام اپنے اوپر حرام کیا۔ خدا کی درگاہ سے روز روز اُس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔

اتفاقاً وہ سوداگر بھی آ پہنچا اور میرا مال امانت میرے حوالے کیا۔ میں نے اُسے اونے پونے بیچ ڈالا اور دارُو درمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مردِ جرّاح ہمیشہ آتا جاتا۔ تھوڑے عرصے میں سب زخم بھر کر انگور کر لائے۔ بعد کئی دن کے غسلِ شفا کا کیا۔ عجب طرح کی خوشی حاصل ہوئی۔ خلعت اور اشرفیاں عیسیٰ حجام کے آگے دھریں اور اُس پری کو مُکلّف فرش بچھا کر مسند پر بٹھایا۔ فقیر غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی۔ اُس دن گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی اس فقیر کے ہاتھ لگی اور اُس پری کا شفا پانے سے ایسا رنگ نکھرا کہ مکھڑا سورج کی (4) مانند چمکنے اور کُندن کی طرح دَمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی جو اُس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بہ سروچشم اُس کے حکم میں حاضر رہتا، جو فرماتی سو بجالاتا۔ وہ اپنے حسن کے غرور اور سرداری کے دماغ میں جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی: خبردار! اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دم نہ ماریو جو ہم کہیں سو بلا عذر کیے جائیو، اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو، نہیں تو پچھتاوے گا۔ اُس کی وضع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق میری خدمت گزاری اور فرماں برداری کا اُسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اُس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا، اُس کا فرمانا بہ سروچشم بجالاتا۔

ایک مدت اسی راز و نیاز میں گئی۔ جو اُس نے فرمایش کی، وہیں میں نے لا کر حاضر کی۔ اس فقیر پاس جو کچھ جنس اور نقد اصل و نفع کا تھا، سب صَرف ہوا۔ اُس بیگانے مُلک میں کون اعتبار کرے جو قرض دام سے کام چلے؟ آخر تکلیف روز مرّے کے خرچ کی ہونے لگی۔ اس سے دل بہت گھبرایا، فکر سے دُبلا ہوتا چلا، چہرے کا رنگ کمھلا گیا لیکن کس سے کہوں! جو کچھ دل پر گزرے سو گزرے! قہرِ درویش برجانِ درویش! ایک دن اُس پری نے اپنے شعور سے دریافت کر کے کہا: اے فلانے! تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نقش کالحجر ہے، پر اُس کا عوض بالفعل ہم سے نہیں ہوسکتا۔ اگر واسطے خرچ ضروری کے کچھ درکار ہو تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر، ایک ٹکڑا کاغذ اور دوات قلم حاضر کر۔ میں نے تب معلوم کیا کسی ملک کی بادشاہ زادی ہے جو اس دل و دماغ سے گفتگو کرتی ہے: فی الفور قلم دان آگے رکھ دیا۔ اُس نازنین نے ایک رُقعہ دستخطِ خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا: قلعے کے پاس تر پولیا ہے، وہاں اُس کوچے میں ایک حویلی بڑی سی ہے، اُس مکان کے مالک کا نام سیدی بہار ہے۔ تُو جا کر اس رقعے کو اُس تلک پہنچا دے۔

فقیر مُوافق فرمانے اُس کے، اسی نام و نشان پر منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ دربان کی زبانی کیفیت خط کی کہلا بھیجی۔ وہیں سنتے ہی ایک حبشی جوان

خوبصورت، ایک پھینٹا طرح دار سجے ہوئے باہر نکل آیا۔ اگر چہ رنگ سانولا تھا، پر گویا تمام نمک بھرا ہوا۔ میرے ہاتھ سے خط لے لیا، نہ بولا نہ کچھ پوچھا، اُنھیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں سَر بہ مُہر، زربفت کے تورہ پوش پڑے ہوئے، غلاموں کے سر پر دھرے باہر آیا، کہا: اس جوان کے ساتھ جا کر یہ گوشے پہنچا دو۔ میں بھی سلام کر رخصت ہوا، اپنے مکان میں لایا۔ آدمیوں کے دروازے کے باہر سے رخصت کیا۔ وہ کشتیاں امانت حضور میں اُس پری کے گزرانیاں۔ دیکھ کر فرمایا: یہ گیارہ بدرے اشرفیوں کے لے اور خرچ میں لا؛ خدا رزّاق ہے۔ فقیر اس نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگر چہ خاطر جمع ہوئی، پر دل میں یہ خلش رہی، یا الٰہی! یہ کیا صورت ہے؟ بغیر پوچھے سمجھے اتنا مال نا آشنا صورت اجنبی نے ایک پُرزے کاغذ پر میرے حوالے کیا! اگر اُس پری سے یہ بھید پوچھوں، تو اس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا۔ مارے ڈر کے دَم نہیں مار سکتا تھا۔

بعد آٹھ دن کے وہ معشوقہ مجھ سے مخاطب ہوئی کہ حق تعالیٰ نے آدمی کو انسانیت کا جامہ عنایت کیا ہے کہ نہ پھٹے نہ میلا ہو۔ اگر چہ پُرانے کپڑے سے اُس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا، پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اعتبار نہیں پاتا۔ دو تُوڑے اشرفی کے ساتھ لے کر چوک کے چوراہے پر یوسف سوداگر کی دُکان میں جا اور کچھ رقم جواہر کے بیش قیمت اور دو خلعتیں زرق برق کی مول لے آ۔ فقیر دو نہیں سوار ہو کر اُس کی دُکان پر گیا۔ دیکھا تو ایک جوان شکیل، زعفرانی جوڑا پہنے گدی پر بیٹھا ہے اور اُس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم دیکھنے کے لیے دُکان سے بازار تک کھڑا ہے۔ فقیر کمالِ شوق سے نزدیک جا کر سلامٌ علیک کر کر بیٹھا اور جو جو چیز مطلوب تھی، طلب کی۔ میری بات چیت اُس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی۔ اُس جوان نے گرم جوشی سے کہا: جو صاحب کو چاہیے سب موجود ہے لیکن یہ فرمایئے کس مُلک سے آنا ہوا اور اس اجنبی شہر میں رہنے کا کیا باعث ہے؟ اگر اس حقیقت سے مُطّلع کیجیے تو مہربانی سے بعید نہیں۔ میرے تئیں اپنا احوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ کچھ بات بنا کر اور جواہر پوشاک لے کر اور قیمت اُس کی دے کر رخصت چاہی۔ اُس جوان نے رو کھے پھیکے ہو کر کہا: اے صاحب! اگر تم کو ایسی ہی نا آشنائی کرنی تھی تو پہلے دوستی اتنی گرمی سے کرنی کیا ضرور تھی؟ بھلے آدمیوں میں صاحب سلامت کا پاس بڑا ہوتا ہے۔ یہ بات اس مزے اور انداز سے کہی، بے اختیار دل کو بھائی اور بے مُروّت ہو کر وہاں سے اُٹھنا انسانیت کے مُناسب نہ جانا۔ اس کی خاطر پھر بیٹھا اور بولا: تمھارا فرمانا سر آنکھوں پر، میں حاضر ہوں۔

اِتنے کہنے سے بہت خوش ہوا، ہنس کر کہنے لگا: اگر آج کے دن غریب خانے پر کرم کیجیے تو تمھاری بدولت مجلس خوشی کی جما کر دو چار گھڑی دل بہلا دیں اور کچھ کھانے پینے کا شغل باہم بیٹھ کر کریں۔ فقیر نے اُس پری کو کبھو اکیلا نہ چھوڑا تھا؛ اُس کی تنہائی یاد کر کر چند در چند عذر کیے، پر اُس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ آخر وعدہ اُن چیزوں کو پہنچا کر میرے پھر آنے کا لے کر اور قسم کھلا کر رخصت دی۔ میں دُکان سے اُٹھ کر، جواہر اور خلعتیں اُس پری کی خدمت میں لایا۔ اس نے قیمت جواہر کی اور حقیقت جوہری کی پوچھی۔ میں نے سارا احوال مول تول کا او رمہمانی کے بجِد ہونے کا کہہ سنایا۔ فرمانے لگی: آدمی کو اپنا قول قرار پورا کرنا واجب ہے؛ ہمیں خدا کی نگہبانی میں چھوڑ کر اپنے وعدے کو وفا کر۔ ضیافت قبول کرنی سُنّت رسول کی ہے۔ تب میں نے کہا: میرا دل چاہتا نہیں کہ تمھیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں، اور حکم یوں ہوتا ہے؛ لاچار جاتا ہوں۔ جب تلک آؤں گا، دل یہیں لگا رہے گا۔ یہ کہہ کر پھر اُس جوہری کی دُکان پر گیا۔ وہ مونڈھے پر بیٹھا میرا انتظار کھینچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا: آؤ مہربان! بڑی راہ دکھائی۔

وہیں اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا۔ جاتے جاتے ایک باغ میں لے گیا۔ وہ بڑی بہار کا باغ کا تھا۔ حوض اور نہروں میں فوارے چھوٹتے تھے، میوے طرح بہ طرح کے پھل رہے تھے، ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہا تھا، رنگ بہ رنگ کے جانور اُن پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے اور ہر مکانِ عالی شان میں فرش ستھرا بچھا تھا۔ وہاں لبِ نہر ایک بنگلے میں جا کر بیٹھا۔ ایک دم کے بعد آپ اُٹھ کر چلا گیا، پھر دوسری پوشاک معقول پہن کر آیا۔ میں نے دیکھ کر کہا: سبحان اللہ! چشم بددور! سُن کر مسکرایا اور بولا: مناسب یہ ہے کہ صاحب بھی اپنا لباس بدل ڈالیں۔ اُس کی خاطر میں نے بھی دوسرے کپڑے پہنے۔ اُس جوان نے بڑی ٹیپ ٹاپ سے تیاری ضیافت کی کی اور سامان خوشی کا جیسا چاہیے موجود کیا اور فقیر سے صحبت بہت گرم کر مزے کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ساقی صُراحی و پیالہ بلّور کا لے کر حاضر ہوا اور گزک کئی قسم کی لا رکھی، نمک دان چُن دیے۔ دَورِ شراب کا شروع ہوا۔ جب دو چار جام کی نوبت پہنچی۔ چار لڑکے امَرد، صاحبِ جمال زُلفیں کھولے ہوئے مجلس میں آئے، گانے بجانے لگے۔ یہ عالم ہوا اور ایسا سماں بندھا، اگر تان سین اُس گھڑی ہوتا تو اپنی تان بھول جاتا اور بیجو باورا سُن کر باولا ہو جاتا۔ اس مزے میں ایک بارگی وہ جوان آنسو بھر لایا، دو چار قطرے بے اختیار نکل پڑے اور فقیر سے بولا: اب ہمارے تمھارے دوستی جانی ہوئی، پس دل کا بھید دوستوں سے چھپانا کسو مذہب میں درست نہیں۔ ایک بات بے تکلف آشنائی کے بھروسے کہتا ہوں، اگر حکم کرو تو اپنی معشوقہ کو بُلوا کر اس مجلس میں تسلی اپنے دل کی کروں۔ اُس کی جدائی سے جی نہیں لگتا۔

یہ بات ایسے اشتیاق سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے فقیر کا دل بھی مشتاق ہوا۔ میں نے کہا: مجھے تمھاری خوشی درکار ہے، اس سے کیا بہتر، دیر نہ کیجیے، سچ ہے معشوق بن کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اُس جوان نے چلون کی طرف اشارت کی۔ وونہیں ایک عورت کالی کلوٹی بھتنی سی، جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل

مرجاوے، جوان کے پاس آن بیٹھی۔ فقیر اُس کے دیکھنے سے ڈر گیا، دل میں کہا: یہی بَلا محبوبہ ایسے جوانِ پری زاد کی ہے جس کی اِتنی تعریف اور اِشتیاق ظاہر کیا! میں لاحَول پڑھ کر چُپ ہو رہا۔ اُسی عالم میں تین دن رات مجلس شراب اور راگ رنگ کی جمی رہی۔ چوتھی شب کو غلبہ نشے اور نیند کا ہُوا۔ میں خوابِ غفلت میں بے اختیار سو گیا۔ جب صبح ہوئی، اُس جوان نے جگایا، کئی پیالے خُمار شِکنی کے پلا کر اپنی معشوقہ سے کہا: اب زیادہ تکلیف مہمان کو دینی خوب نہیں۔

دونوں ہاتھ پکڑ کے اُٹھے۔ میں نے رخصت مانگی، خوشی بہ خوشی اجازت دی۔ تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لیے، اپنے گھر کی راہ لی اور اُس پری کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ مگر ایسا اِتفاق کبھو نہ ہوا تھا کہ اُسے تنہا چھوڑ کر شب باش کہیں ہوا ہوں۔ اِس تین دن کی غیر حاضری سے نہایت خجل ہو کر عذر کیا اور قصہ ضِیافت کا اور اُس کے نہ رخصت کرنے کا سارا عرض کیا۔ وہ ایک دانا زمانے کی تھی، تبسم کر کے بولی: کیا مضائقہ اگر ایک دوست کی خاطر رہنا ہوا؟ ہم نے مُعاف کیا، تیری کیا تقصیر ہے! جب آدمی کسو کے گھر جاتا ہے، تب اُس کی مرضی سے پھر آتا ہے۔ لیکن یہ مُفت کی مہمانیاں کھا پی کر چُپکے ہو رہو گے یا اس کا بدلا بھی اُتارو گے؟ اب یہ لازم ہے کہ جا کر اُس سوداگر بچے کو اپنے ساتھ لے آؤ اور اُس سے دو چند ضِیافت کرو اور اسباب کا کچھ اندیشہ نہیں، خدا کے کرم سے ایک دم میں سب لوازمہ تیار ہو جائے گا اور بہ خوبی مجلس ضِیافت کی رونق پاوے گی۔ فقیر مُوافق حُکم کے جوہری پاس گیا اور کہا: تمھارا فرمانا میں تو سر آنکھوں سے بجا لایا، اب تم بھی مہربانی کی راہ سے میری عرض قبول کرو۔ اُس نے کہا: جان و دل سے حاضر ہوں۔

تب میں نے کہا: اگر اِس بندے کے گھر تشریف لے چلو، عَین غریب نوازی ہے۔ اُس جوان نے بہت عذر اور حیلے کیے، پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وہ راضی ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کو اپنے مکان پر لے چلا لیکن راہ میں یہی فکر کرتا آتا تھا کہ اگر آج اپنے تئیں مقدور ہوتا تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا۔ اب میں اِسے لیے جاتا ہوں، دیکھیے کیا اِتفاق ہوتا ہے۔ اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے، گلیارے میں جھاڑ دے کر چھڑکاو کیا ہے۔ یساوُل اور عصے بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا۔ دیکھا تو تمام حویلی میں فرشِ مُکلّف لائق ہر مکان کے جابہ جا بچھا ہے اور مَسندیں لگی ہیں۔ پان دان، گلاب پاش، عطردان، پیک دان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کنولے، نارنگیاں اور گلابیاں رنگ بہ رنگ کی چُنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز اَبرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ اور سَرو کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں۔ سب آدمی اپنے اپنے عُہدوں پر مُستعد ہیں۔ باورچی خانے میں دیگیں ٹھنٹھنا رہی ہیں۔ آب دار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے۔ کوری کوری ٹھلیاں روپے کی گھڑونچیوں پر صافیوں سے بندھیں اور جھجروں سے ڈھکی رکھی ہیں۔ آگے چوکی پر ڈونگے، کٹورے بہ مع تھالی، سَر پوش دھرے۔ بَرف کے آب خورے لگ رہے ہیں اور شورے کی صُراحیاں ہل رہی ہیں۔ غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے اور کنچنیاں، بھانڈ، بھگتیے، کلاونت، قوال، اچھی پوشاک پہنے ساز کے سُر ملائے حاضر ہیں۔

فقیر نے اُس جوان کو لے جا کر مسند پر بٹھایا اور دِل میں حیران تھا کہ یا الٰہی! اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیوں کر ہوئی! ہر طرف دیکھتا پھرتا تھا لیکن اس پَری کا نشان کہیں نہ پایا۔ اسی جستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا، دیکھتا ہوں تو وہ نازنین ایک مکان میں گلے میں کُرتی، پانو میں تہہ پوشی، سر پر سفید رومالی اوڑھے ہوئے سادی خوزادی بِن گہنے پاتے بنی ہوئی:

نہیں محتاج زیور کا، جسے خوبی خدا نے دی
کہ جیسے خوش نُما لگتا ہے دیکھو چاند، بِن گہنے

خبر گیری میں ضیافت کی لگ رہی ہے اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار! بامزہ ہو اور آب و نمک بوباس دُرست رہے۔ اس محنت سے وہ گلاب سا بدن سارا پسینے پسینے ہو رہا ہے۔

میں پاس جا کر تصدّق ہوا اور اس شعور و لیاقت کو سَراہ کر دُعائیں دینے لگا۔ یہ خوشامد سُن کر تیوری چڑھا کر بولی: آدمی سے ایسے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو تو اتنا حیران ہو رہا ہے؟ بس بہت باتیں بنانیں مجھے خوش نہیں آتیں۔ بھلا کہہ تو، یہ کون آدمیت ہے کہ مہمان کو اکیلا بیٹھا کر اِدھر اُدھر پڑے پھرے؟ وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا! جلد جا مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطر داری کر اور اُس کی معشوقہ کو بھی بلوا کر اُس کے پاس بٹھلا۔ فقیر وونہیں اُس جوان کے پاس گیا اور گرم جوشی کرنے لگا۔ اتنے میں دو غلام صاحب جمال صُراحی اور جام جڑاؤ ہاتھ میں لیے روبرو آئے، شراب پلانے لگے۔ اِس میں میں نے اُس جوان سے کہا: میں سب طرح مخلص اور خادم ہوں، بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب جمال کہ جس کی طرف دل صاحب کا مائل ہے، تشریف لاوے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ تو آدمی بُلانے کی خاطر جاوے۔ یہ سنتے ہی خوش ہو کر بولا: بہت اچھا! اِس وقت تم نے میرے دِل کی بات کہی۔ میں نے ایک خوجے کو بھیجا۔ جب آدھی رات ہو گئی، وہ چُڑیل خاصے چوڈول پر سوار ہو کر بَلائے ناگہانی سی آ پہنچی۔

فقیر نے لاچار خاطر سے مہمان کی اِستقبال کر کر نہایت تپاک سے برابر اُس جوان کے لا بٹھایا۔ جوان اُس کے دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دُنیا کی نعمت ملی۔ وہ بھتنی بھی اُس جوانِ پری زاد کے گلے لپٹ گئی۔ سچ مچ یہ تماشا ہوا

جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے۔ جتنے مجلس میں آدمی تھے، اپنی اپنی اُنگلیاں دانتوں میں دابنے لگے کہ کیا کوئی بَلا اِس جوان پر مُسلّط ہوئی! سب کی نگاہ اُسی طرف تھی۔ تماشا مجلس کا بھول کر اُس کا تماشا دیکھنے لگے۔ ایک شخص کنارے سے بولا: یارو! عشق اور عقل میں ضد ہے، جو کچھ عقل میں نہ آوے، یہ کافر عشق کر دکھاوے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو۔ سبھوں نے کہا: آمنّا، یہی بات ہے۔

یہ فقیر بہ موجب حکم کے مہمان داری میں حاضر تھا۔ ہر چند جوان ہم پیالہ ہم نوالہ ہونے کو مُجوِّز ہوتا تھا، پر میں ہرگز اُس پری کے خوف کے مارے اپنا دِل کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرف رُجوع نہ کرتا تھا اور عذر مہمان داری کا کرکے اُس کے شامل نہ ہوتا۔ اسی کیفیت سے تین شبانہ روز گزرے۔ چوتھی رات وہ جوان نہایت جوشش سے مجھے بلا کر کہنے لگا: اب ہم بھی رخصت ہوں گے۔ تمھاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر تین دن سے تمھاری خدمت میں حاضر ہیں؛ تم بھی تو ہمارے پاس ایک دم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔ میں نے اپنے جی میں خیال کیا، اگر اس وقت کہنا اس کا نہیں مانتا تو آزردہ ہوگا؛ پس نئے دوست اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے، تب یہ کہا: صاحب کا حُکم بجا لانا منظور کہ الامر فوق الادب۔ سُنتے ہی اس کو، جوان نے پیالہ تواضع کیا اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا پیہم دور چلا کہ تھوڑی دیر میں سب آدمی مجلس کے کیفی ہوکر بے خبر ہو گئے اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب دو نیزے بلند ہوا، تب میری آنکھ کھلی تو دیکھا میں نے نہ وہ تیاری ہے، نہ وہ مجلس، نہ وہ پری، فقط خالی حویلی پڑی ہے مگر ایک کونے میں کمل لپٹا ہوا دھرا ہے۔ جو اُس کو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اُس کی رنڈی، دونوں سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواس جاتے رہے۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ یہ کیا تھا اور کیا ہوا! حیرانی سے ہر طرف تک رہا تھا؛ اتنے میں ایک خواجہ سرا (جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا) نظر پڑا۔ فقیر کو اُس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی، احوال اس واردات کا پوچھا۔ اُس نے جواب دیا: تجھے اس بات کے تحقیق کرنے سے کیا حاصل جو تو پوچھتا ہے؟ میں نے بھی اپنے دل میں غور کی کہ سچ تو کہتا ہے۔ پھر ایک ذرا تامُّل کر کے میں بولا: خیر نہ کہو، بھلا یہ تو بتا دو وہ معشوقہ کس مکان میں ہے؟ تب اُس نے کہا: البتہ جو میں جانتا ہوں، سو کہہ دوں گا؛ لیکن تجھ سا آدمی عقل مند، بے مرضی حضور کے، دو دن کی دوستی پر بے مُحابا بے تکلف ہوکر صحبت مے نوشی کی باہم گرم کرے، یہ کیا معنے رکھتا ہے!

فقیر اپنی حرکت اور اُس کی نصیحت سے بہت نادم ہوا۔ سوائے اس بات کے زبان سے کچھ نہ نکلا: فی الحقیقت اب تو تقصیر ہوئی، مُعاف کیجیے۔ بارے محلی نے مہربان ہوکر اُس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے رُخصت کیا، آپ اُن دونوں زخمیوں کے گاڑنے دابنے کی فکر میں رہا۔ میں تہمت سے اُس فساد کی الگ ہوا اور اشتیاق میں اُس پری کے ملنے کے لیے گھبرایا ہوا، گرتا پڑتا ڈھونڈتا، شام کے وقت اُس کوچے میں اُسی پتے پر جا پہنچا اور نزدیک دروازے کے ایک گوشے میں ساری رات تلپھتے کٹی، کسو کی آمد و رفت کی آہٹ نہ ملی اور کوئی احوال پُرساں میرا نہ ہوا۔ اُسی بے کسی کی حالت میں صبح ہو گئی۔ جب سورج نکلا، اُس مکان کے بالا خانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہ رو میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس وقت عالم خوشی کا جو مجھ پر گزرا، دل ہی جانتا ہے؛ شکر خدا کا کیا۔

اتنے میں ایک خوجے نے میرے پاس آ کر کہا: اُس مسجد میں تو جا کر بیٹھ، شاید تیرا مطلب اُس جگہ بَر آوے اور اپنے دل کی مُراد پاوے۔ فقیر فرمانے سے اُس کے، وہاں سے اُٹھ کر اُسی مسجد میں جا رہا لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے، میں نے بھی وہ روز ویسی ہی بے قراری میں کاٹا۔ بارے جس تس طرح سے شام ہوئی اور دن پہاڑ سا چھاتی پر سے ٹلا۔ ایک بارگی وہی خواجہ سرا (جن نے اُس پری کے مکان کا پتا دیا تھا) مسجد میں آیا۔ بعد فراغت نمازِ مغرب کے، میرے پاس آ کر اُس شفیق نے (کہ سب راز و نیاز کا مَحرم تھا) نہایت تسلی دے کر ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا۔ رفتہ رفتہ ایک باغیچے میں مجھے بٹھا کر کہا: یہاں رہو، جب تلک تمھاری آرزو برآوے؛ اور آپ رُخصت ہوکر، شاید میری حقیقت حضور میں کہنے گیا۔ میں اُس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالم اور حوض، نہروں میں فوارے، ساون بھادوں کے اُچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا، لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اُس گل بدن کا خیال آتا، جب چاند پر نظر پڑتی تب اُس مہ رو کا مُکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اُس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔

بارے خدا نے اُس کے دِل کو مہربان کیا، ایک دم کے بعد وہ پری دروازے سے، جیسے چودھویں رات کا چاند، بناؤ کیے گلے میں پشواز بادلے کی سنجاف کی، موتیوں کا دردامن ٹکا ہوا اور سر پر اوڑھنی جس میں آنچل پلو، لہر، گوکھرو لگا ہوا، سر سے پانو تک موتیوں میں جڑی، رَوِش پر آ کر کھڑی ہوئی۔ اُس کے آنے سے تر و تازگی نئے سر سے اُس باغ کو اور اس فقیر کے دل کو ہو گئی۔ ایک دم اِدھر اُدھر سیر کر کر شہ نشین میں مُغرّق مَسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی۔ میں دوڑ کر پروانے کی طرح (جیسے شمع کے گرد پھرتا ہے) تصدق ہوا اور غلام کی مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا۔ اس میں وہ خوجہ میری خاطر بہ طور سفارش کے عرض کرنے لگا۔ میں نے اُس محلی سے کہا: بندہ گنہ گار تقصیر وار ہے، جو کچھ سزا میرے لائق ٹھہرے، سو ہو۔ وہ پری اَز بس کہ ناخوش تھی، بد دماغی سے بولی کہ اب اس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لیوے، اپنا اسباب دُرست کر کے وطن کو سدھارے۔

میں یہ بات سنتے ہی کاٹھ ہوگیا اور سوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے تو ایک بوند لہو کی نہ نکلے اور تمام دُنیا آنکھوں کے آگے اندھیری لگنے لگی اور ایک آہ نامرادی کی بے اختیار جگر سے نکلی، آنسو بھی ٹپکنے لگے۔ سوائے خدا کے اُس وقت کسو کی توقع نہ رہی، مایوسِ محض ہو کر اتنا بولا: بھلا ٹک اپنے دل میں غور فرمایئے اگر مجھ کم نصیب کو دُنیا کا لالچ ہوتا تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا۔ کیا ایک بارگی حق خدمت گزاری اور جاں نثاری کا عالم سے اُٹھ گیا، جو مجھ سے کم بخت پر اتنی بے مہری فرمائی؟ خیر اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں۔ معشوقوں کی بے وفائی سے بے چارے عاشق نیم جاں کا نباہ نہیں ہوتا۔

یہ سن کر تیکھی ہو، تیوری چڑھا کر خفگی سے بولی: چہ خوش! آپ ہمارے عاشق ہیں! مینڈکی کو بھی زُکام ہوا! اے بے وقوف!! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانیں خیالِ خام ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات! بس چپ رہ، یہ کلمی بات چیت مت کر اگر کسی اور نے یہ حرکتِ بے معنی کی ہوتی، پروردگار کی سوں، اُس کی بوٹیاں کٹوا چیلوں کو بانٹتی۔ پر کیا کروں، تیری خدمت یاد آتی ہے۔ اب اسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانا پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔ پھر میں نے روتے بسورتے کہا: اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑ میں سر ٹکراتا پھروں تو لاچار ہوں۔ اس بات سے بھی دق ہو کہنے لگی: میرے تئیں یہ پھسا ہند سے چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اس اشارے کی گفتگو کے جو لائق ہو، اُس سے جا کر کر۔ پھر اُسی خفگی کے عالم میں اُٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی۔ میں نے بہتیرا سر پٹکا، متوجہ نہ ہوئی۔ لاچار میں بھی اُس مکان سے اُداس اور نااُمید ہو کر نکلا۔

غرض چالیس دن تک یہی نوبت رہی۔ جب شہر کی کوچہ گردی سے اُکتاتا، جنگل میں نکل جاتا۔ جب وہاں سے گھبراتا، پھر شہر کی گلیوں میں دیوانہ سا آتا۔ نہ دن کو کھاتا، نہ رات کو سوتا، جیسے دھوبی کا کُتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زندگی انسان کی کھانے پینے سے ہے، آدمی اناج کا کیڑا ہے۔ طاقت بدن میں مطلق نہ رہی، اپاہج ہو کر اُسی مسجد کی دیوار کے تلے جا پڑا کہ ایک روز وہی خواجہ سرا جمعے کی نماز پڑھنے آیا، میرے پاس سے ہو کر چلا۔ میں یہ شعر آہستہ ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا۔

اِس دردِ دل سے موت ہو، یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہو، الٰہی! شتاب ہو

اگرچہ ظاہر میں صورت میری بالکل تبدیل ہوگئی تھی، چہرے کی یہ شکل بنی تھی کہ جن نے مجھے پہلے دیکھا تھا، وہ بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وُہی آدمی ہے! لیکن وہ محلی آواز درد کی سن کر متوجہ ہوا، میرے تئیں بہ غور دیکھ کر افسوس کیا اور شفقت سے مخاطب ہوا کہ آخر یہ حالت اپنی پہنچائی۔ میں نے کہا: اب تو جو ہوا سو ہوا، مال سے بھی حاضر تھا، جان بھی تصدُّق کی: اُس کی خوشی یوں ہی ہوئی تو کیا کروں!

یہ سن کر ایک خدمت گار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا۔ نماز اور خطبے سے فراغت کر کر جب باہر نکلا، فقیر کو ایک میانے میں ڈال کر اپنے ساتھ خدمت میں اس پری بے پروا کی لے جا کر چق کے باہر بٹھایا۔ اگرچہ میری رُوہت کچھ باقی نہ رہی تھی، پر مدت تلک شب و روز اُس پری کے پاس اتفاق رہنے کا ہوا تھا؛ جان بوجھ کر بے گانی ہو کر خوجے سے پوچھنے لگی: یہ کون ہے؟ اُس مردِ آدمی نے کہا: یہ وُہی کم بخت بدنصیب ہے جو حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا، اسی سبب سے اس کی یہ صورت بنی ہے۔ عشق کی آگ سے جلا جاتا ہے؛ ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بجھاتا ہے، پر وہ دونی بھڑکتی ہے، کچھ فائدہ نہیں ہوتا؛ علاوہ اپنی تقصیر کی خجالت سے مُوا جاتا ہے۔ پری نے ٹھٹھولی سے فرمایا: کیوں جھوٹھ بکتا ہے! بہت دن ہوئے اُس کی خبر وطن پہنچنے کی مجھے خبرداروں نے دی ہے۔ واللہ اعلم یہ کون ہے اور تو کس کا ذکر کرتا ہے! اُس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر التماس کیا: اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ فرمایا: کہہ، تیری جان تجھے بخشی۔ خوجا بولا: آپ کی ذات قدردان ہے۔ واسطے خدا کے چلون کو درمیان سے اُٹھوا کر پہچانیے اور اُس کی بے کسی کی حالت پہ رحم کیجیے؛ ناحق شناسی خوب نہیں۔ اب اس کے احوال پر جو کچھ ترس کھایئے؛ بجا ہے اور جائے ثواب ہے، آگے حدِ ادب، جو مزاجِ مبارک میں آوے سو ہی بہتر ہے۔

اتنے کہنے پر مسکرا کر فرمایا: بھلا کوئی ہو، اسے دارُالشفا میں رکھو۔ جب بھلا چنگا ہوگا، تب اس کے احوال کی پرسش کی جائے گی۔ خوجے نے کہا: اگر اپنے دستِ خاص سے گلاب اس پر چھڑکیے اور زبان سے کچھ فرمایئے تو اس کو اپنے جینے کا بھروسا بندھے۔ نا امیدی بُری چیز ہے۔ دنیا بہ اُمید قائم ہے۔ اس پر بھی اُس پری نے کچھ نہ کہا۔ یہ سوال جواب سُن کر میں بھی اپنے جی سے اُکتا رہا تھا؛ بِدھڑک بول اٹھا کہ اب اس طور کی زندگی کو دل نہیں چاہتا، پانو تو گور میں لٹکا چکا ہوں، ایک روز مرنا ہے، اور علاج میرا بادشاہ زادی کے ہاتھ میں ہے، کریں یا نہ کریں، وہ جانیں۔ بارے مُقَلِّبُ القُلُوب نے اُس سنگ دل کے دل کو نرم کیا۔ مہربان ہو کر فرمایا: جلد بادشاہی حکیموں کو حاضر کرو۔ وہ نہیں طبیب آ کر جمع ہوئے۔ نبض، قارورہ دیکھ کر بہت غور کی۔ آخرش تشخیص میں ٹھہرا کہ یہ شخص کہیں عاشق ہوا ہے؛ سوائے وصلِ معشوق کے اِس کا کچھ علاج نہیں۔ جس وقت وہ ملے، یہ صحت پاوے۔ جب حکیموں کی بھی زبانی یہی مرض میرا

ثابت ہوا، حکم کیا: اِس جوان کو گرمابے میں لے جاؤ؛ نہلا کر خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔ وونہیں مجھے باہر لے گئے۔ حمام کروا، اچھے کپڑے پہنا، خدمت میں پری کی حاضر کیا۔ تب وہ نازنیں تپاک سے بولی: تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رسوا کیا، اب اور کیا کیا چاہتا ہے؟ جو تیرے دل میں ہے صاف صاف بیان کر۔

یا فُقرا! اس وقت یہ عالم ہوا کہ شادی مرگ ہو جاؤں۔ خوشی کے مارے ایسا پھُولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا اور صورت شکل بدل گئی۔ شکر خدا کا کیا اور اُس سے کہا: اِس دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مُردے کو ایک بات میں زندہ کیا؛ دیکھو تو اُس وقت سے اِس وقت تک میرے اَحوال میں کیا فرق ہو گیا! یہ کہہ کر تین بار گرد پھرا اور سامھنے آ کر کھڑا ہوا اور کہا: حُضور سے یوں حکم ہوتا ہے کہ جو تیرے جی میں ہو سو کہہ؛ بندے کو ہَفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ یہ ہے کہ غریب نوازی کر کر اس عاجز کو قبول کیجیے اور اپنی قدم بوسی سے سَرفرازی دیجیے۔ ایک لحظہ تو سُن کر غوطے میں گئی، پھر کَن انکھیوں سے دیکھ کر کہا: بیٹھو، تم نے خدمت اور وفاداری ایسی ہی کی ہے، جو کچھ کہو سو پھبے ہے اور اپنے بھی دل پر نقش ہے؛ خیر ہم نے قبول کیا۔

اُسی دن اچھی ساعت سُبھ لگن میں چپکے چپکے قاضی نے نِکاح پڑھ دیا۔ بعد اتنی محنت اور آفت کے خدا نے یہ دن دکھایا کہ میں نے اپنے دل کا مُدّعا پایا، لیکن جیسی دل میں آرزو اُس پری سے ہم بستر ہونے کی تھی، ویسی ہی جی میں بے کلی اُس وارداتِ عجیب کے معلوم کرنے کی تھی کہ آج تک میں نے کچھ نہ سمجھا کہ یہ پری کون ہے؟ اور وہ حبشی سانولا سجیلا (جس نے ایک پُرزے کاغذ پر اتنی اشرفیوں کے بدِرے میرے حوالے کیے) کون تھا؟ اور تیاری ضِیافت کی بادشاہوں کے لائق ایک پَہر میں کیوں کر ہوئی؟ اور وے دونوں بے گُناہ اُس مجلس میں کس لیے مارے گئے؟ اور سبب خفگی اور بے مروّتی کا باوجود خدمت گزاری اور ناز برداری کے مجھ پر کیا ہوا؟ اور پھر ایک بارگی اس عاجز کو یوں سَر بلند کیا؟ غرض اِسی واسطے بعد رسم رُسوماتِ عقد کے آٹھ دن تلک، باوصف اُس اِشتیاق کے قصد مُباشرت کا نہ کیا۔ رات کو ساتھ سوتا، دن کو یونہیں اُٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن غُسل کرنے کے لیے میں نے خواص کو کہا کہ تھوڑا پانی گرم کر دے تو نہاؤں۔ ملکہ مُسکرا کر بولی: کس برتے پر تتا پانی؟ میں خاموش ہو رہا۔ لیکن وہ پری میری حرکت سے حیران ہوئی بلکہ چہرے پر آثار خفگی کے نُمود ہوئے، یہاں تلک کہ ایک روز بولی: تم بھی عجب آدمی ہو، یا اُتنے گرم یا ایسے ٹھنڈے! اس کو کیا کہتے ہیں؟ اگر تم میں قوت نہ تھی تو کیوں ایسی کچی ہَوَس پکائی؟ اُس وقت میں نے بے دھڑک ہو کر کہا: اے جانی! مُنصفی شرط ہے، آدمی کو چاہیے کہ انصاف سے نہ چوکے۔ بولی: اب کیا انصاف رہ گیا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔ فقیر نے کہا: واقعی بڑی آرزو اور مُراد میری یہی تھی سو مجھے ملی لیکن دل میرا اُدبدھے میں ہے اور دودِلے آدمی کی خاطر پریشان رہتی ہے، اُس سے کچھ ہو نہیں سکتا، انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا کہ بعد اس نِکاح کے (کہ عَین دل کی شادی ہے) بعضی بعضی باتیں (جو خیال میں نہیں آتیں اور نہیں کھلتیں) حضور میں پوچھوں گا کہ زبانِ مبارک سے اُس کا بیان سُنوں، تو جی کو تسکین ہو۔ اُس پری نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا: کیا خوب! ابھی سے بھول گئے۔ یاد کرو، بارہا ہم نے کہا ہے کہ ہمارے کام میں ہرگز دَخل نہ کیجو اور کسی بات کے مُعتَرِض نہ ہو جو۔ خلافِ معمول ہو۔ یہ بے اَدبی کرنی کیا لازم ہے؟ فقیر نے ہنس کر کہا: جیسی اور بے ادبیاں مُعاف کرنے کا حکم ہے ایک یہ بھی سہی۔ وہ پَری نظریں بدل کر جھیے میں آ کر آگ کا بگُولا بن گئی اور بولی: اب تو بہت سر چڑھا! جا اپنا کام کر، اِن باتوں سے تجھے کیا فائدہ ہو گا؟ میں نے کہا: دُنیا میں اپنے بدن کی شرم سب سے زیادہ ہوتی ہے لیکن ایک دوسرے کا واقف کار ہوتا ہے؛ پس جب ایسی چیز دل پر روا رکھی تو اور کون سا بھید چھپانے کے لائق ہے؟

میری اس رمز کو وہ پری دُقوف سے دریافت کر کر کہنے لگی: یہ بات سچ ہے، پر جی میں یہ سوچ آتا ہے کہ اگر مجھ نگوڑی کا راز فاش ہو تو بڑی قیامت مچے۔ میں بولا: یہ کیا مذکور ہے! بندے کی طرف سے یہ خیال دل میں نہ لاؤ اور خوشی سے ساری کیفیت جو بیتی ہے، فرماؤ۔ ہرگز ہرگز میں دل سے زباں تک نہ لاؤں گا، کسو کے کان پڑنا کیا امکان ہے۔ جب اُس نے دیکھا کہ اب سوائے کہنے کے اس عزیز سے چھٹکارا نہیں، لاچار ہو کر بولی: ان باتوں کے کہنے میں بہت سی خرابیاں ہیں، تو خواہ مخواہ درپئے ہوا۔ خیر تیری خاطر عزیز ہے اس لیے اپنی سرگذشت بیان کرتی ہوں؛ تجھے بھی اُس کا پوشیدہ رکھنا ضرور ہے، خبر شرط!

غرض بہت سی تاکید کر کر کہنے لگی میں بدبخت مُلکِ دمشق کے سُلطان کی بیٹی ہوں اور وہ سلاطینوں سے بڑا بادشاہ ہے۔ سوائے میرے کوئی لڑکا بالا اُس کے یہاں نہیں ہوا۔ جس دن سے میں پیدا ہوئی ماباپ کے سایے میں ناز و نعمت اور خوشی خُرمی سے پلی۔ جب ہوش آیا تب اپنے دل کو خوب صورتوں اور نازنینوں کے ساتھ لگایا۔ چنانچہ ستھری ستھری پری زاد ہمجولی اُمرازادیاں مصاحبت میں؛ اور اچھی اچھی قبول صورت ہم عمر خواصیں سہیلیاں خدمت میں رہتی تھیں۔ تماشا ناچ اور راگ رنگ کا ہمیشہ دیکھا کرتی۔ دُنیا کے بھلے بُرے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اپنی بے فکری کے عالم کو دیکھ کر سوائے خدا کے شکر کے کچھ مُنہ سے نہ نکلتا تھا۔

□□□

مسعود حسین خاں (ہماری مطبوعات سے)

قومی یک جہتی اور ہندوستانی زبانیں

قومیت اور قومی یک جہتی سیاسیات کے جدید تصورات اور اصطلاحیں ہیں۔ قومیت کا تصور تاریخِ یورپ میں اٹھارھویں صدی عیسوی کی دین ہے۔ اس کا پہلا اظہار اس صدی کے وسط میں انگلستان میں ہوا اور اسی صدی کے آخر میں اس نے انقلاب فرانس کے لیے راہ ہموار کی۔ ہندوستان پہنچتے پہنچتے اسے سو سال کا عرصہ لگ گیا اور بالآخر بیسویں صدی میں اس نے ایشیا میں ایک ہمہ گیر تصور کی حیثیت اختیار کر لی۔

قومی یک جہتی یا ایکتا کی اصطلاح اور بھی زیادہ نئی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ کوئی سیاسی اصطلاح ہی نہیں اور اگر ہے تو ایک منفی اصطلاح ہے اس لیے کہ قومیت کا تصور اپنے اندر یک جہتی کے وہ تمام مضمرات رکھتا ہے جس سے ایک اچھی اور متحدہ قومیت عبارت ہوتی ہے۔ وہ قومیت ہی کیا جو یک جہتی سے عاری ہو۔ دراصل آزادی ملنے کے بعد ہندوستان کے گوناگوں مسائل میں ایک مسئلہ قومیت کا بھی تھا جس کے استحکام کے لیے قومی یک جہتی یا ایکتا کی اصطلاح تراشنی پڑی اور اس تصور کو عام کرنے کے لیے قومی یک جہتی کونسل کا قیام عمل میں آیا، کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور اب ادارے قائم کیے جا رہے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ملک قومیت کے اعتبار سے اپنے آپ پر مکمل بھروسا نہیں کرتا تھا اور 'باہمہ' کے مقابلے میں 'بے ہمہ' کے عناصر سرگرم عمل تھے۔ چوں کہ ہندوستان، مذاہب، زبانوں، نسلوں اور ثقافتوں کے لحاظ سے ایک برصغیر کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس میں انگلستان یا فرانس کی سی یک لسانی یا یک تہذیبی کی وحدت ڈھونڈنا عبث تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مشترک جغرافیائی حالات، مشترک تاریخ اور مشترک معیشت کے عناصر اس کے مختلف النسل باشندوں کو ایک وحدت میں جکڑے رہے ہیں لیکن ہندوستانی قومیت، قومیت کی اکثر شرائط سے عاری تھی۔ چنانچہ آزادی ملنے اور غلامی کی بخشی ہوئی وحدت کے تانے بانے ٹوٹنے کے بعد ہمارے اہل فکر نے اس بات کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ سیاسی و جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ایک ایسا دستور وضع کیا جائے جو وفاقیت کے بجائے مرکزیت کا حامل ہو۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ علاقائیت فرقہ واریت اور لسانی علاحدگی پسندی کے میلانات تیزی سے ابھرنے لگے تھے جن کا مقابلہ کرنا ملک کی سالمیت کے لیے ضروری تھا۔ ہمارے دستور سازوں کی نیت برحق تھی لیکن یہ صرف تاریخ بتائے گی کہ یہ دستور کہاں تک ہمارے قومی تقاضوں کا ساتھ دے سکے گا۔

یورپ کی چھوٹی چھوٹی قومیتوں کے پیش نظر مفکرین سیاسیات نے قومیت کی ایک اہم شرط لسانی وحدت بھی بتائی ہے۔ ایسا کہتے وقت ان کے سامنے انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی جیسے ممالک کی قومیتیں تھیں لیکن جیسے جیسے قومیت کا مغربی تصور ایشیا میں عام ہوتا گیا اور ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملکوں میں آزمایا جانے لگا، اس کے مسائل سامنے آنے لگے۔ یوں تو ہندوستان چھوٹی بڑی کئی درجن زبانوں اور بولیوں کا مجموعہ ہے لیکن دستور ہند کی تشکیل کے وقت گرما گرم بحث کے بعد صرف چودہ بڑی زبانوں پر اتفاق رائے ہو سکا۔ بعد میں دستور کے آٹھویں شیڈول کی فہرست میں پندرھویں صدی سندھی کا اضافہ اور کر دیا گیا۔ انگریزی حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے ان زبانوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔ (1) آسامی (2) بنگالی (3) گجراتی (4) ہندی (5) کنڑ (6) کشمیری (7) ملیالم (8) مراٹھی (9) اوڑیا (10) پنجابی (11) سنسکرت (12) سندھی (13) تمل (14) تلگو (15) اردو

"عام طور پر یہ مغالطہ پیدا ہو گیا ہے کہ جن زبانوں کی فہرست اس شیڈول میں دی ہوئی ہے وہ علاقائی زبانیں ہیں۔ یہ واقعہ نہیں۔ بلکہ اس فہرست میں صرف ان زبانوں کے نام دیے ہوئے ہیں جن کی نمائندگی اس کمیشن میں ہوگی جسے دفعہ 344 (1) کے بموجب راشٹرپتی مقرر کریں گے۔"

(ہندوستان کا دستور اور اس کی مختصر شرح: ہارون خان شیروانی)

زبانوں کی اس فہرست کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبانوں کی اس ترتیب میں کوئی لسانی شعور کارفرما نہیں بلکہ یہ اہل سیاست کی ایک الجھے ہوئے معاملے کے سلسلے میں محض لیپا پوتی ہے۔ مثلاً پندرہ زندہ زبانوں میں ایک غیر مروجہ کلاسیکل زبان یعنی سنسکرت بھی شامل ہے۔ بارہ

"مقالاتِ مسعود" سے ماخوذ، از: مسعود حسین خاں، صفحات 230، قیمت : -/18.50

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

صاحب ریاست زبانوں کے ساتھ دو ایسی زبانیں بھی شامل کردی گئیں جن کے بولنے والے کسی بھی علاقے میں اکثریت میں نہیں، یعنی اردو اور سندھی۔ ان میں سندھی کی حالت اردو سے بھی خستہ ہے۔ اسی لیے وہ پہلی فہرست میں شامل نہیں کی گئی تھی اور صرف سندھی بولنے والوں کے اصرار پر 1967 میں دستور میں اکیسویں ترمیم کے ذریعے داخل کی گئی ہے۔ بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے اردو ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے تاہم یہ کسی بھی ریاست میں دس فی صد سے زیادہ کی دعویدار نہیں ہوسکتی۔

ہندوستان کی مذکورہ بالا پندرہ زبانیں لسانی نقطۂ نظر سے تین خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن میں دو بڑے خاندان (1) ہند آریائی اور (2) دراوڑ ہیں۔ ان میں ہند آریائی سب سے بڑا خاندان ہے اس لیے کہ 15 میں سے دس زبانوں، آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی، مراٹھی، اوڑیا، پنجابی، سنسکرت، سندھی اور اردو کا تعلق اس خاندان سے ہے۔ دراوڑ خاندان کی صرف چار زبانیں شامل فہرست ہیں۔ یعنی کنڑ، ملیالم، تمل اور تلگو۔ کشمیری کا تعلق تیسرے خاندان سے ہے۔

دستور میں دی ہوئی زبانوں کی اس فہرست سے اس مغالطۂ لسانی کا امکان ہے کہ ہم بہت سی ایسی بڑی بولیوں کو نظرانداز کردیں جن کی اپنی تاریخی اور علاقائی انفرادیت ہے۔ ان میں ہندی کے علاقے میں بھوجپوری اور راجستھانی قابلِ ذکر ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی نے اسی وجہ سے 15 نہیں 21 زبانوں کو اپنی منظورشدہ فہرست میں انعامات اور نمائندگی کے لیے جگہ دی ہے۔

زبانوں کے اس ''مینارِ بابل'' کا مقابلہ ہمارے دستور سازوں نے دفعہ 343 کے ذریعے کیا ہے جس میں یونین کی سرکاری زبان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

1. ''یونین کی سرکاری زبان ہندی ہوگی جسے دیوناگری لپی میں لکھا جائے گا۔''

''یونین کی سرکاری غرضوں کے لیے جو عدد استعمال کیے جائیں گے ان کی شکل وہی ہوگی جو ہندوستانی عددوں کی بین قومی شکل ہے۔

2. باوجود ضمن (1) کے کسی اندراج کے، اس دستور کے جاری ہونے کے پندرہ برس تک یونین کے تمام ایسے مقصدوں کے لیے جن کے واسطے انگریزی زبان اس دستور کے جاری ہونے سے ٹھیک پہلے استعمال ہوتی تھی، برابر اسی طرح استعمال ہوتی رہے گی.....''

دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں ہندی کو نہ صرف یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ یونین کی سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی ہے بلکہ دفعہ 345 کی رو سے ہندی کو اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ، ہماچل پردیش اور دہلی کی ریاستوں نے بھی اپنی سرکاری زبان بنادیا ہے۔

یہ ہے ہندوستان کا لسانی نقشہ۔

تین مختلف خاندانِ السنہ کی 15 منظور شدہ زبانیں، جن میں سے دو، اردو اور سندھی کے اپنے علاقے نہیں۔ ایک بین الاقوامی بدیسی اور ایک غیر مروج کتابی زبان۔ ان میں تال میل ہو تو کیسے ہو؟ 1956 میں ہندوستان کو لسانی ریاستوں میں تقسیم کردیا گیا جس کی وجہ سے ریاستی زبانوں کی اہمیت بڑھ گئی اور ساتھ ہی کوئی ایسی ریاست باقی نہیں رہی جس میں اقلیتی زبانوں کے مسئلے پیدا نہ ہوگئے ہوں جن کے حل کے لیے دفعہ 350، 350 (الف) اور 350 (ب) وضع کی گئی جن میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کی سہولتوں اور لسانی اقلیتوں کے لیے خاص عہدیدار مقرر کرنے کا تذکرہ ہے۔

غیر ہندی دانوں کی تالیف قلب کے لیے سرکاری زبان یعنی ہندی کے لیے دفعہ 351 میں ایک لائحہ عمل بھی تیار کیا ہے جو لسانی مسائل پر اہل سیاست کی کنجلک فکر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ سنیے:

''یونین کا فرض ہوگا ہندی زبان کے پھیلاؤ کی حوصلہ افزائی کرے اور اسے اس طرح ترقی دے کہ وہ ہندوستان کے ایک کلچر کے سارے عنصروں کے اظہار خیال کا ذریعہ بن جائے اور اس زبان کو اس طرح مالا مال کرے کہ وہ اپنی روح کو متاثر کیے بغیر اس میں ہندوستانی زبان اور ان زبانوں کی شکلیں، اسلوب اور اظہار کے طریقے جذب ہوجائیں جن کا آٹھویں شیڈول میں ذکر کیا گیا ہے نیز اس کی لغت کے لیے بنیادی طور پر سنسکرت زبان سے اور ثانوی طور پر دوسری زبان سے لفظ حاصل کیے جائیں۔''

(''ہندوستان کا دستور اور اس کی شرح''، ترجمہ: ہارون خاں شیروانی)

ہمارے دستور کا یہ لسانی ہدایت نامہ ایک ایسی دستاویز ہے جس پر ع

ناطقہ سربہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

لسانیاتی نقطۂ نظر سے اس میں صرف ایک مثبت تجویز ہے۔ ''اس کی لغت کے لیے بنیادی طور پر سنسکرت زبان سے لفظ حاصل کیے جائیں'' جو ہندی اپنی اصطلاحات سازی کے لیے کر رہی ہے۔ زبانیں ہدایت ناموں سے نہیں بنا کرتیں ان کے ارتقا کی اپنی ڈگر ہوتی ہے۔

قومی یک جہتی کے خواہش مند لوگ اکثر اوقات لسانی یک جہتی اور لسانی وحدت میں امتیاز نہیں کرتے۔ لسانی وحدت اس ملک کا مقدر نہیں، ہر چند آزادی کی پہلی گرمی میں بعض ناعاقبت اندیشوں نے انھی خطوط پر سوچنا شروع کردیا تھا۔ ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ زبان کے معاملے میں جماعتیں بعض اوقات مذہب سے بھی زیادہ جذباتی ہوجاتی ہیں۔ بنگلہ دیش کا عبرت ناک انجام ہمارے سامنے ہے جہاں مشترک مذہب بھی پاکستانی قومیت کو ٹکڑے ٹکڑے

ہونے سے نہیں بچا سکا۔ پنجاب کی موجودہ سیاست میں بھی کافی حد تک لسانی جذبے کی کارفرمائی ہے۔ اردو والوں کی تلخی کام و دہن بھی کچھ اسی سبب سے رہتی ہے۔ کنڑ اور مراٹھی کی سرحدی زور آزمائی کا بھی یہی باعث ہے۔ تلنگو دیشم کی تحریک میں بھی ''تلنگو'' جزو اصلی ہے۔

غرض کہ لسانی سطح پر ہر طرف ایک انتشار کا سا عالم دکھائی دیتا ہے۔ یک جہتی اور ایکتا کا کوئی نعرہ اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا۔ اس لیے حب وطن اور عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی قومیت کے دیگر مسائل کی طرح ہندوستان کے لسانی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ لسانی ایکتا کا رولر پھیرنے کی کوشش نہیں کریں بلکہ ہر زبان کے بولنے والوں کے تقاضوں اور مانگوں پر انصاف کے نقطۂ نظر سے ہمدردانہ طور پر غور کریں۔ زبان کو شخصیت متحرک کہا گیا ہے۔ تہذیب کے ایک خارجی مظہر ہونے کے باوجود بعض اوقات اس کی اہمیت کسی تہذیب کے تمام عقائد سے فزوں تر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسی میں اہل زبان خود کی بازیافت کرتا ہے۔ اسی کے ذریعے وہ بے نام کو نام دیتا ہے۔ خود عقائد کی پرورش اسی کی گود میں ہوتی ہے۔ غرض کہ پوری تہذیب کا محور اور مظہر زبان ہوتی ہے۔ آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہندومت اور اسلام بغیر سنسکرت اور عربی کے کیا ہوتے؟ گیتا کے الفاظ کی گونج ذہن کے کس کس گوشے تک پہنچتی ہے، قرآن کا اعجاز خون کی گردش کو کس طرح تپش آمادہ تر کر دیتا ہے، یہ سوال نہیں حقیقت ہے۔ ہمارے عظیم شعرا کس طرح زندگی کے ہر ہر موڑ پر اپنے مرصّع الفاظ اور تراکیب سے ہمارا ساتھ دیتے ہیں اور کس طرح وہ ہمارے شعور کا حصہ بن گئے ہیں۔ ادب نواز ہی نہیں بندہ نواز بھی جانتے ہیں، شعور بغیر زبان کے محض ایک تصور ہے۔

کثیر لسانی ممالک کے لسانی حل کے کئی نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر سوئزرلینڈ اور ہالینڈ کی قومیتیں ہیں جہاں ایک سے زائد زبانیں رائج ہیں اور ان سب کو برابر طور پر سرکاری زبانیں تسلیم کیا گیا ہے۔ سوئزرلینڈ میں تو جرمن اور فرانسیسی جیسی دو ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ اطالوی خاندان کی ایک بولی کو بھی جس کے بولنے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے کم ہے، سرکاری طور سے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ایک نمونہ ہمارے سامنے کناڈا کا ہے۔ جہاں کی ہمہ گیر زبان انگریزی ہے لیکن چند ذیلی علاقوں میں فرانسیسی کو بھی مساوی حقوق حاصل ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ میں بھی یورپ کی کئی زبانیں بولنے والے آباد ہوئے۔ خاص طور پر اس کی جنوبی ریاستوں ٹیکساس، اری زونا، جنوبی کیلیفورنیا وغیرہ میں ہسپانوی زبان بولنے والے بڑی تعداد میں بس گئے تھے اور ان علاقوں میں عرصہ تک ہسپانوی زبان کا چلن بڑے پیمانے پر رہا لیکن رفتہ رفتہ تاریخ کی گردشوں میں انگریزی ہسپانوی پر غالب آتی گئی۔ اس طرح کہ اب ریاست ہائے متحدہ کی انگریزی واحد زبان کہی جاسکتی ہے۔ ہر چند وہاں ہسپانوی اور فرانسیسی پڑھنے والے اور اس زبان اور تہذیب پر فخر کرنے والے آج بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

لسانی حل کا ہمارے سامنے ایک اور بڑا نمونہ اشتراکی روس کا ہے جہاں کئی خاندانوں کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مثلاً ازبک کا تعلق ترکی خاندان السنہ سے ہے اور تاجیک کا ایرانی خاندان سے ہے۔ زار روس کے زمانے میں بھی اور اشتراکی روس کی حکومت میں بھی اقتدار روسی زبان کا رہا ہے۔ روسی ترکستان کی بولیوں کے لیے پہلے رومن رسم خط کو آزمایا گیا۔ پھر مصلحتاً روسی خط میں ان کو لکھا جانے لگا۔ ہر صورت میں قدیم فارسی و عربی رسم خط سے اجتناب کیا گیا۔ آج روس کی لسانی وحدت کی نیو روسی زبان ہے جو شروع سے اس قدر ترقی یافتہ رہی ہے کہ یورپی روس ہو کہ روسی ترکستان کی زبانیں، ان سب پر چھائی رہی ہے۔ لسانی مسئلے کے حل کرنے میں روس کے آہنی نظام حکومت سے بھی مدد ملی۔ چاہے وہ زار روس کا عہد ہو یا ''طریق کوہکن'' انداز وہی پرویزی رہے۔ یہ صورت ہندوستان جیسی جمہوریت میں ناممکن ہے جہاں عوام ذرا سی ناراضگی میں حکمرانوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتے ہیں۔ چنانچہ وہ لسانی فاشسٹ بھی جو آزادی کے ابتدائی نشے میں یہ سوچ رہے تھے کہ ہندوستان کی کثیر لسانی پر روس کا سا یک لسانی رولر پھیر سکیں گے۔ رفتہ رفتہ اس کے قائل ہوتے گئے کہ یہاں یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ ہندی ایک ووٹ سے سرکاری زبان تو بنادی گئی لیکن صرف اس کو قومی زبان (راشٹر بھاشا) تسلیم کیا جائے یہ کسی طرح سے غیر ہندی بولنے والوں کے گلے سے نیچے نہیں اتر سکا اس لیے کہ راشٹر بھاشائیں، تو ہندوستان کی سبھی زبانیں ہیں...... دوسرے الفاظ میں روس کا لسانی ماڈل یہاں رائج نہیں ہوسکتا اس لیے کہ نہ تو یہاں ہندی کی وہ حیثیت ہے جو روسی کی چلی آئی ہے اور نہ یہاں کا سیاسی نظام اجازت دیتا ہے کہ عوام کے ہونٹوں پر تالے لگا دیے جائیں۔ اتفاق سے آزادی حاصل ہونے کے وقت ہندی، ہندوستان کی کئی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ بھی نہیں۔ ہندی کی آناً فاناً ترقی تو آزادی ملنے کے بعد ہوئی ہے۔ مثلاً آزادی سے قبل اردو واحد زبان تھی جس میں یونیورسٹی کی سطح تک اعلیٰ تعلیم دی جارہی تھی اور مراٹھی تنہا زبان تھی جس میں ایک بڑے پیمانے پر انسائیکلو پیڈیا شائع ہوچکی تھی۔ بنگالی اور تمل بھی کئی لحاظ سے ہندی سے زیادہ ترقی یافتہ زبانیں تھیں۔

لہٰذا ملی جلی معیشت کی طرح قومی سطح پر لسانی مسائل کے حل کے لیے ہمیں اپنا مخصوص ماڈل بنانا پڑے گا۔ میرے نقطۂ نظر سے اس ماڈل کے بنیادی مسائل حسب ذیل ہوں گے۔

1. لسانی انصاف پسندی، جس کی رو سے ہندوستان کی تمام زبانیں، قومی

تسلیم کی جائیں گی۔ زبانیں بڑی ہوسکتی ہیں یا چھوٹی، ترقی یافتہ ہوسکتی ہیں یا ترقی پذیر لیکن کسی کو کسی پر یہ کہہ کر فوقیت نہیں دی جاسکتی کہ یہ زیادہ قومی ہے اور دوسری کم تر۔ اگر ہندی قدیم ہندوستان کی بہترین ترجمان کہی جاسکتی ہے تو اردو وسطی دور کے ہندوستان کی سچی نمائندہ کہی جائے گی۔ تمل قبل آریائی ہندوستان کی صدائے بازگشت رکھے گی۔ ہمارا تاریخی مقدر رنگارنگی ہے۔ بقول غالب:

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

2. لیکن لسانی انصاف پسندی کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم خود کو ایک قسم کی لسانی طوائف الملوکی میں گرفتار کرلیں۔ اگر بڑی زبان بولنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ چھوٹی زبانوں کو پنپنے کا بھرپور موقع دیں اور ان کو اپنا حریف نہ سمجھیں تو چھوٹی زبانیں بولنے والوں کی جانب سے یہ انصاف پسندی ہوگی کہ وہ بڑے کے بڑپن کو تسلیم کریں اور اس کو اس کا مقام دیں۔ چنانچہ دستور ہند میں ہمارے دستور سازوں نے ہندی کے لیے یہی کیا ہے جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے۔ ہندی سات ریاستوں کی سرکاری زبان ہے اور 1971 کی مردم شماری کے مطابق اس کے بولنے والوں کی مجموعی تعداد 15 کروڑ چالیس لاکھ کے قریب تھی۔ ظاہر ہے دوسری کسی زبان کے بولنے والے ساڑھے چار کروڑ سے زیادہ نہیں، مثلاً تلگو بنگالی اور مراٹھی جو علی الترتیب ہندوستان کی دوسری تیسری اور چوتھی زبانیں ہیں۔ اس لحاظ سے ہندی کو فوقیت حاصل ہے اور رابطہ کی زبان کی حیثیت سے اس کا سرکاری زبان کے منصب پر فائز کیا جانا انصاف کے عین مطابق ہے۔ شروع شروع میں بعض ترقی یافتہ زبانوں مثلاً بنگالی اور تمل والوں نے منہ چڑایا تھا لیکن ان کے سامنے چارۂ کار نہیں اس لیے کہ یہ دونوں زبانیں بولنے والوں کو بجا طور پر یہ بھی سہولت دی گئی کہ دستور کے نفاذ کے 15 سال بعد تک انگریزی سرکاری زبان کے طور پر ہندی کے ساتھ رائج رہے گی۔ اس مدت میں پنڈت نہرو نے بعد کو یہ توسیع کی کہ انگریزی ساتھی زبان کی حیثیت سے رائج رہے گی۔ جب تک غیر ہندی والے خود اس بات کی خواہش نہ کریں کہ اسے ہٹا دیا جائے۔ میرے خیال میں لسانی سمجھوتے کے سلسلے میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں نکالی جاسکتی۔

3. ہندوستان کے لسانی ماڈل کی دوسری بڑی شرط یہ ہوگی (اور یہ انصاف پسندی کے تقاضوں کے عین مطابق ہے) کہ بدیسی زبان اس ملک میں سرکاری یا تعلیمی کاروبار کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں تھوپی جاسکتی۔ دوسرے الفاظ میں انگریزی کی وہ حیثیت قائم نہیں رکھی جاسکتی جو اب تک رہی ہے۔ اس کا مقام رابطہ کی زبان کی حیثیت سے ہندی کو اور ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ریاستی زبانوں کو ملنا چاہیے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کی سرکاری اور تعلیمی زبان کوئی بدیسی ہو، چاہے وہ کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ اس ملک میں انگریزی کے لیے ایک مقام رہے گا۔ ایک عالمی زبان کی حیثیت سے اور مغربی علوم تک رسائی کے لیے یہ زبان ہمارے تعلیمی اداروں میں یقیناً جگہ پائے گی لیکن نہ اس طرح جس طرح کہ اب تک رہی اور جس طرح آج بھی ہمارے 'قوم پرست' اس کو رکھنا چاہتے ہیں۔ آزادی کے بعد سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندی کی جو رفتار ترقی ہونا چاہیے تھی، مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ نہیں رہی ہے۔ دستور کی دفعہ 344 کے باوجود جس میں واضح الفاظ میں ہدایت ہے کہ:

1. راشٹرپتی کے لیے ضروری ہوگا کہ دستور کے جاری ہونے سے پانچ برس گزرنے پر اور اس کے بعد اس کے جاری ہونے سے دس برس گزرنے پر اپنے حکم کے ذریعے ایک کمیشن مقرر کریں۔

2. اس کمیشن کا فرض ہوگا کہ راشٹرپتی کو حسب ذیل معاملات کے بارے میں سفارش کرے۔

(ا) یونین کے سرکاری مقصدوں کے لیے ہندی زبان کا بڑھتا ہوا استعمال۔

(ب) کسی سرکاری مقصد یا سب سرکاری مقصدوں کے لیے انگریزی زبان کے استعمال کی حد بندی۔

افسوس کا مقام ہے کہ جنوبی ہند کی ریاستوں اور بنگال کی بالخصوص مخالفت کی وجہ سے کمیشنوں کے تقرر کے باوجود یہ حد بندی نہ ہوسکی اور انگریزی آج بھی اسکولوں، کالجوں اور سرکاری دفتروں میں ٹھسّے سے جاری ہے۔

ہماری لسانی یک جہتی میں انگریزی کا ڈر اب تک موجود ہے۔ یہ کسی تنگ قوم پرستی کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اپنی لسانیاتی معلومات کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ جو ریاستیں انگریزی کی حمایت کررہی ہیں وہ ہندوستان کی قومی یک جہتی کی جڑیں کاٹ رہی ہیں۔ نوآبادیاتی ممالک کے علاوہ دنیا کی کوئی آزاد قوم کسی بدیسی زبان کو وہ مقام نہیں دیتی جو ہندوستان نے انگریزی کو دے رکھا ہے۔ انگریزی کی بدولت ہمارے ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو معاشی، ثقافتی اور سرکاری تمام وسائل اور سہولتوں کا مالک بن گیا ہے۔ انگریزی نے ہمارے نونہالوں کے ذہنوں کو ابتدائی مدارج سے مفلوج بنا رکھا ہے۔ دنیا کا کوئی ملک اپنے نظام تعلیم میں کسی غیر زبان کو ابتدائی مدارج میں ذریعۂ تعلیم نہیں بناتا جو ہم نے بنا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم توتے کی رٹائی کے مانند ہوتی ہے اور خیال کا کوئی شگوفہ ان ذہنوں میں نہیں کھلتا۔ انگریزی کی جگہ اگر یہی مقام ہندی کو دے دیا گیا تو یہی بات غیر ہندی زبانوں کے مقابلے میں اس کے بارے میں کہی جاسکے گی۔ ذریعۂ تعلیم ہونے کا حق صرف مادری زبان کا ہوتا ہے۔ اختیاری مضمون کی حیثیت سے آپ چاہے دنیا کی کوئی زبان پڑھائیں اس میں مضائقہ نہیں۔

3. ہندوستان کی زبانوں کے تال میل میں سنسکرت زبان کا ایک خاص اور اہم مقام ہے جسے بروئے کار لانے کی مزید ضرورت ہے۔ سنسکرت کی نہ صرف شمالی ہندوستان کی تمام زبانوں پر (سوائے اردو اور کشمیری) کے چھاپ ہے بلکہ جنوب میں بہ تمل کو چھوڑ کر تلگو، کنڑ، ملیالم کے ارتقا میں بھی کم وبیش اسی طرح سے اثر انداز ہوئی ہے۔ خصوصاً اس کی اعلیٰ لفظیات اور اصطلاحات علمیہ میں علمی اصطلاحات سازی میں سنسکرت کا یہ رول جاری رہنا چاہیے۔ البتہ تمل اردو اور کشمیری کی مانند جو زبانیں ''سنسکرتیت'' کے عمل کو اپنے تاریخی ارتقا کی مجبوریوں کی وجہ سے قبول نہیں کرتیں، انھیں چھوٹ ملنا چاہیے اور ان پر سنسکرت بنیاد اصطلاحات علمیہ کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ آزادی کے فوراً بعد ہندی کے بعض ودوانوں نے کوشش کی تھی۔ خاص طور پر دستور ہند کے ترجمے کے سلسلے میں جس کے لیے بنی بنائی اصطلاحیں دے دی گئی تھیں جو دوسری زبانوں نے کم وبیش اپنا لیں لیکن اردو اور تمل والوں نے اپنی معذوری ظاہر کر کے بالآخر اپنی وضع کردہ اصطلاحوں میں اس کا ترجمہ کیا جس کے اقتباسات، میں اس خطبے میں جا بجا دیتا آیا ہوں۔ اس ضمن میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہمیں لاطینی بنیاد بین الاقوامی اصطلاحات علمیہ سے یک لخت منہ نہیں موڑ لینا چاہیے۔ یہ ضرور ہے کہ دو ماخذوں سے ماخوذ علمی اصطلاحات سے زبان میں ایک کھچڑی کی سی کیفیت ضرور پیدا ہو جائے گی لیکن لسانی ارتقا کی دوڑ میں جو زبانیں بعد کو داخل ہوتی ہیں انھیں اس قسم کے لسانی سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ مجموعی طور پر اصطلاحات علمیہ کے لیے ہمارا قبلہ سنسکرت زبان ہی کی طرف ہونا چاہیے۔

4. قومی یک جہتی کے سلسلے میں لسانی اکثریت کا رویہ لسانی اقلیت کی جانب ہمدردانہ ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اردو کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ گو لسانی اقلیتوں کو دشواریاں مہاراشٹر، کرناٹک، آسام اور آندھرا ہر جگہ کم و بیش موجود ہیں۔ ملک کی بدنصیب تقسیم نے اردو کے مسئلے کو ایک مخصوص سیاسی اور فرقہ وارانہ رنگ دے دیا ہے اس لیے قومی یک جہتی کے سلسلے میں اس کا ذکر ''اردو بنیاد'' شہر میں ذرا تفصیل سے کرنا چاہوں گا۔

لسانی نقطۂ نظر سے اردو ایک ہند آریائی زبان ہے جو دہلی اور نواح دہلی (حضرت امیر خسرو کے مطابق ''زبانِ دہلی و پیرامن اؤ'') کی بولی پر مبنی ہے۔ خود شہر دہلی کئی بولیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ جمنا کے اس پار کھڑی بولی کا علاقہ ہے اور اس پار ہریانوی کا۔ چالیس میل کی دوری سے جنوب میں برج بھاشا کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ صوتیات قواعد اور ستر فی صد لفظیات کا ماخذ وہی ہے جو موجودہ ہندی کا ہے۔ البتہ چند آوازیں --- خ، غ، ز، ف اور ق --- اور تیس فی صد الفاظ و اصطلاحات علمیہ اس کی عربی فارسی سے لی گئی ہیں۔ ان میں بھی بہت کم الفاظ ایسے ہیں جو براہ راست عربی سے لیے گئے ہوں، یہ سب کے سب فارسی کے وسیلے سے اردو تک پہنچے ہیں کیا باعتبار تلفظ کیا باعتبار معنی، اس لیے کہ اردو ہندوستان کی تاریخ کے درمیانی دور میں ادبی و درباری زبان کی حیثیت سے رائج رہی ہے۔ اردو کو انگریزی نے پہلی بار 1835 میں فارسی کو ہٹا کر سرکاری و عدالتی زبان بنایا تھا۔ اس کی ایک اور اہم شناخت اس کا رسم الخط ہے جو عربی و فارسی رسم الخط کی توسیع شدہ شکل ہے۔ توسیع شدہ شکل اس لیے کہ اردو کی معکوسی آوازیں (ٹ، ڈ، ڑ) اور نفسی آوازوں کا سلسلہ (پھ، بھ، تھ، ٹھ، دھ وغیرہ) نہ تو فارسی میں پائے جاتے ہیں اور نہ عربی میں، یہ اردو والوں کی ایجاد ہیں۔ ان کے لیے بھی دو لکیریں اور کبھی چار نقطوں سے کام لیا گیا، جس نے بالآخر الٹے (ط) کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح نفسی آوازوں کے لیے دو چشمی (ھ) کا استعمال کیا گیا لیکن اس کے استعمال میں وہ ضابطگی نہ آسکی جو معکوس آوازوں کے ضوبے میں ملتی ہے۔ اردو اپنی شعر و شاعری کی روایات، عروض اور اصطلاحات علمیہ کے لیے بھی فارسی، عربی کی گراں بار ہے۔ اس کا ادبی اسلوب دکنیات سے لے کر پریم چند اور اقبالیات تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں ایک ریختہ و آمیختہ زبان ہے اور اسی لیے ایک مخصوص حسن اور توانائی کی حامل جو صرف ریختہ زبانوں کو حاصل ہوتا ہے۔

ہمارے دستور کی رو سے آٹھویں شیڈول کی 15 زبانوں میں سے ایک اردو ہے، بولنے والوں کی مجموعی تعداد کے لحاظ سے یہ ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے۔ یعنی گجراتی، ملیالم، کنڑ، اڑیا، پنجابی، آسامی اور کشمیری سے بڑی۔ 1971 کی مردم شماری کی رو سے اس کے بولنے والوں کی مجموعی تعداد 28600428 تھی۔ کم از کم ہندوستان کے تیرہ اضلاع ایسے ہیں جہاں اس کے بولنے والوں کی تعداد 45 تا 26 فی صد ہے۔ ان میں اتر پردیش کے رام پور، مرادآباد، بجنور، سہارن پور بھی شامل ہیں، جہاں علی الترتیب اردو بولنے والوں کی 45-33-29 فیصد پائی جاتی ہے۔ تاہم مجموعی طور پر اس کے بولنے والوں کی تعداد کسی ریاست میں 12 فیصد سے زائد نہیں۔ یہ اتر پردیش میں ایک کروڑ، بہار میں 50 لاکھ، مہاراشٹر میں 37 لاکھ، آندھرا پردیش میں 33 لاکھ اور کرناٹک میں 26 لاکھ سے زائد کی تعداد میں موجود ہیں۔ جموں و کشمیر میں جہاں کی یہ سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی ہے، مادری زبان کی حیثیت سے اس کے نام لیوا چند ہزار سے زائد نہیں۔ اردو کا مسئلہ ایک لسانی معمہ ہے جس کا حل قومی سطح پر ڈھونڈنا ہوگا۔ آزادی کے بعد اس کا نظام تعلیم درہم برہم کر دیا گیا جس کے نتیجے میں آج جو لوگ چالیس سے اوپر ہیں انھی کے دل میں اس کا درد باقی رہ گیا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، اس کو محبوبہ و معشوقہ بنانے والے آج بھی بہت لوگ ہیں لیکن اس کو بیوی کا درجہ دینے والے بہت کم ہیں۔ یعنی بہت کم لوگ

اپنے بچوں کو اس کے ذریعے سے تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ اسی نسبت سے نئی نسل اپنی لسانی انفرادیت اور تشخص سے دور ہوتی جارہی ہے۔ مذہب، لسانی انفرادیت کا بدل نہیں بن سکتا۔ ہر زبان ایک مخصوص تاریخ، ایک مخصوص فکر اور ثقافت کی امین ہوتی ہے۔ اگر ہندوستانی تہذیب کے ''جلوۂ صد رنگ'' کو برقرار رکھنا ہے تو ہر زبان کو اپنی مخصوص ڈگر پر چلنے دینے کی اجازت دینا ہوگی۔ یہ تجاویز کہ اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے یا اس میں ہندی کی اصطلاحات علمیہ کو جوں کا توں شامل کرلیا جائے نہ اردو کے ساتھ انصاف ہوگا اور نہ ہندی کے ساتھ۔ زبانوں میں تبدیلیاں نہایت چپکے اور چھپ کے نمودار ہوتی ہیں۔ ان کے ارتقا کے اپنے اصول اور قاعدے ہوتے ہیں۔ نہ تو وہ جبر سے بدلی جاسکتی ہیں اور نہ کسی سیاسی انقلاب کے دباؤ سے، جیسا کہ انقلاب روس کے بعد وہاں ماہرین لسانیات نے روسی کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی اور غلط ثابت ہونے پر اسٹالن کے عتاب سے بال بال بچ گئے۔ پنجاب کے المیے میں ان لوگوں کے لیے ایک لسانی سبق بھی ہے جو لسانی فاشسزم کو روا رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں پنجاب کا اصل مسئلہ بنگلہ دیش کی طرح لسانی مسئلہ ہے اور اس کے ذمے دار خود پنجاب کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے 1951 کی مردم شماری میں اپنی مادری زبان پنجابی کے بجائے ہندی لکھائی تھی۔

لسانی اکثریت کو، اردو ہو کہ پنجابی، خائف ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ خائف تو کمزور کو ہونا چاہیے اور اردو سے خائف ہونے کی کوئی وجہ جواز ہی نہیں ملتی اس لیے کہ اردو قومی اور بین قومی سطحوں پر ہندی کی حلیف ہے نہ کہ حریف۔ دونوں ایک ہی شاخ کے دو پھول ہیں۔ قومی سطح پر اس کے ذریعے جنوبی ہند کی ریاستوں میں ہندی کے چلن کو مہمیز ملتی ہے اس لیے ان ریاستوں میں اردو مادری زبان لکھوانے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں جب کہ ہندی مادری زبان دانوں کی تعداد ہزاروں سے آگے نہیں بڑھتی۔ ظاہر ہے تمل ناڈو ہو یا کرناٹک یا آندھرا پردیش ہندی کا ایک ہراول دستہ اردو بولنے والوں کی شکل میں وہاں صدیوں سے موجود ہے۔ بین قومی سطح پر اردو کے رول کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے لیکن علم الالسنہ سے دلچسپی رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ عالمی سطح پر اس وقت چار پانچ زبانیں منطقی زبانوں کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آرہی ہیں یعنی انگریزی، روسی، چینی، ہسپانوی اور عربی۔ چھٹی زبان جسے جنوبی ایشیا میں علاقائی زبان کی حیثیت سے وسیلۂ ابلاغ بننے کے امکانات ہیں یہی ہندی اردو کا مجموعہ ہے جس کو عرصے تک ہم ہندستانی کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔ عربی، فارسی رسم الخط میں اس کی تگ و تاز پاکستان، افغانستان، ایران، خلیجی ریاستوں عدن اور پورٹ سعید تک ہے۔ ہندی کی شکل میں یہ مشرقی ہندوستان سے گزرتی ہوئی برما، ملیشیا، سنگاپور اور انڈونیشیا تک پہنچتی ہے، جہاں کی بندرگاہوں میں یہ بول چال اور کاروباری زبان کی حیثیت سے گھر کرتی جارہی ہے۔ اس طرح اس لسانی، دوموہی، کا ایک منطقہ بنتا جارہا ہے جہاں اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد کروڑوں سے تجاوز کرچکی ہے اور اس کا ایک عالمی ادب اور اس کے ساتھ منصب بنتا جارہا ہے۔

ہماری قومی یک جہتی کے لیے لسانی وحدت شرط اولین ہے لیکن یہاں وحدت کا تصور اپنے اندر ''کثرت'' کے پہلو رکھتا ہے۔ جس طرح ہندی کو ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے ترقی دینا ازبس ضروری ہے اسی طرح چھوٹی اور اقلیتی زبانوں کو پھلنے پھولنے کا مکمل موقع دینا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کثرت میں وحدت ہمارا مقدر ہے، ہر زبان کی پاسداری ہمارا ایمان ہے، ہندی کی اولیت ہماری قومی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی وہ کیفیت ربط و اختلاط ممکن ہے جس کی جانب شاعر نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

با ہزاراں چشم باید یک نگاہ

❑❑❑

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی. آر. گیڈگل، پروفیسر ایم. صدیقی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندوستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے وہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343،

قیمت -/130 روپے

صغرا مہدی (ہماری مطبوعات سے)

اقتصادی زندگی میں عورتوں کے لیے مواقع

عورتوں کے اقتصادی رول اور اقتصادی سرگرمیوں میں شرکت کے لیے ان کے مواقع کا بھی کوئی اندازہ سماج کی منزل ارتقا، خاندان اور وسیع تر سماج میں عورتوں کے رول کے متعلق معاشرتی اور ثقافتی رویوں اور حیثیت و مرتبہ کے بنیادی اجزا کے متعلق سماجی نظریات کو الگ کر کے نہیں لگایا جاسکتا۔ ارتقا کی بعض منازل پر کام کرنے کی صلاحیت سماجی حیثیت و مرتبے کا بلند ترین حق فراہم کرسکتی ہے لیکن جب سماج میں مساوات نہ رہے تو کام کے بجائے فرصت سماجی حیثیت و مرتبے کی نشان دہی کرنے والی چیز بن سکتی ہے۔

عورتوں کے اقتصادی رول کے متعلق اور اقتصادی شرکت کے لیے حقوق اور مواقع کی مساوات کی ضرورت کے متعلق تمام بحث تین دلیلوں پر مرکوز ہے:

1. عورت کی معاشی محکومی، دست نگری کی وجہ سے عورت کا استحصال ہوتا ہے اور یہ چیز سماجی انصاف اور اسی نظریے کے تحت حقوق کے منافی ہے۔ کارل مارکس اور مہاتما گاندھی دونوں نے عورت اور مرد کے رول کے درمیان سخت اور بے لوچ امتیاز کی مخالفت کی ہے۔

2. سماج کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں آبادی کے تمام حصے پوری شرکت کریں اور عورتوں کی امکانی صلاحیتوں اور قوتوں کے لیے پورے نشوونما کے مواقع حاصل ہوں۔ ''عورتوں کے خلاف امتیاز کے خاتمہ کا اعلان'' جو یو۔این۔او۔ نے کیا ہے اس کا بنیادی تصور یہی ہے۔

3. قومی اعداد و شمار اور سماجی تبدیلیوں میں جو جدید رجحانات نظر آرہے ہیں مثلاً شادی کی بڑھتی ہوئی عمر، زیادہ چھوٹے خاندان، شہری رنگ میں منتقل ہونے کا رجحان، نقل مقام، بڑھتی ہوئی قیمتیں اور زندگی کے معیار اور فیصلے کرنے میں زیادہ شرکت کے لیے چیخ پکار، یہ سب چیزیں عورتوں کی ذمے داریوں اور رول میں بڑی تبدیلیاں پیدا کررہی ہیں۔ اگر عورتیں اپنی سماجی رکاوٹوں اور درماندگیوں کی وجہ سے ان چیلنجوں کا مقابلہ نہ کرسکیں تو اس کا نتیجہ سماجی بحران کی شکل میں نمودار ہوگا۔

عورتوں کی بڑھتی ہوئی اقتصادی سرگرمیوں کی مخالفت ان چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔

1. یہ قدامت پرستانہ نظریہ کہ عورتوں کے رول بے لوچ طور پر متعین حدود کے اندر محدود ہونے ضروری ہیں (دونوں جنسوں کے درمیان اس تقسیم محنت کے نمونے مختلف رہے ہیں، نہ صرف معاشروں کے درمیان بلکہ معاشروں کے اندر بھی۔) اور

2. یہ ڈر کہ اگر عورتیں بہت بڑے پیمانے پر محنت کی منڈی میں داخل ہوگئیں تو اس کے نتیجے میں بیروزگاری مزمن شکل اختیار کرسکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیشت میں عورتوں کے ''حاشیائی'' رول کے نظریات پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ نظریہ زرعی معاشروں میں ناقابل اطلاق ہے جہاں خاندان پیداوار کی اکائی ہوتا ہے اور مرد، عورتیں اور بچے سب ہی پیداوار کے عمل میں حصہ لیتے ہیں۔ روایتی زرعی اور گھریلو صنعت سے جدید منظم صنعت و خدمات میں تبدیلی اور دیہی علاقوں سے شہری علاقوں میں تبدیلی ایک ایسی چیز ہے جو محنت کی روایتی تقسیم کو تباہ کردیتی ہے اور افراد خاندان کے باہمی تکمیلی رشتے کو ختم کرکے افراد کے درمیان محنت کی اکائیوں کی حیثیت سے باہمی مسابقت کا رشتہ پیدا کردیتی ہے۔ پیداوار کے طریقوں میں ٹیکنیکل تبدیلیوں کی وجہ سے نئی ہنرمندیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان نئی ہنرمندیوں کو حاصل کرنے کے مواقع کے فقدان کی وجہ سے مجبور و معذور عورتیں خود کو نئی معیشت میں غیر مطلوب و غیر ضروری پاتی ہیں۔

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کا سامنا آج ہندوستان کی عورتوں کی بڑی تعداد کو کرنا پڑ رہا ہے۔ روایتی دیہی معیشت میں کاشتکاروں، کاریگروں اور ادنیٰ قسم کی خدمات ادا کرنے والوں کے درمیان عورتیں پیداوار اور فروخت میں امتیازی اور تسلیم شدہ کردار ادا کرتی ہیں اور ان مقامات پر اب بھی ایسا ہی کرتی ہیں، جہاں روایتی معیشت کے طریقے رائج ہیں۔ خاص طور سے ان کسانوں کے درمیان جن کے پاس بہت تھوڑی زمین ہے یا بالکل نہیں ہے نیز بیشتر اچھوت ذاتوں اور قبائلی قوموں کے درمیان اور روایتی صنعتوں اور دستکاروں

''ہندوستان میں عورت کی حیثیت'' سے ماخوذ، مترجم: صغرا مہدی، صفحات 272، قیمت: -/62

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

میں جیسے کپڑا بننا، ٹوکریاں بنانا اور (ہاتھ سے) کھانے، پینے کی چیزیں بنانا۔ اگرچہ عورتوں کے کام کے معیاروں میں علاقائی اختلافات ہیں تاہم روایتی اونچے طبقے کا معیار۔ وہ معیار جو عورتوں کو خاندان کے حدود سے باہر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ابھی تک اونچی حیثیت کی علامت بنا ہوا ہے اور اس کی تقلید بہت سے لوگوں میں کی جاتی ہے جو سماج میں اپنا رتبہ بڑھانا چاہتے ہیں۔

ہندوستانی معیشت میں عورت کا زوال پذیر رول

جن قوتوں نے ہندوستانی معیشت میں عورتوں کے رول کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ یہ ہیں: عام طور پر دستکاریوں کا زوال، زراعت پر بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ، دیہاتی علاقوں میں مفلسی میں اضافہ اور اس کے نتیجے میں نقل مقام۔ بڑھتی ہوئی ٹیکنکل ترقی کے ساتھ جدید صنعت کا نشوونما۔ تعلیم کی اشاعت اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مصارف خاص طور سے شہری علاقوں میں۔ صنعتی ترقی کے ابتدائی مرحلے میں کپڑے اور جوٹ کی صنعت میں بڑی تعداد میں عورتوں اور بچوں کو کام پر اس طرح لگایا گیا کہ ان کو اجرت کی نسبتاً کم شرحوں پر غیر ہنرمندانہ یا نیم ہنرمندانہ قسم کے کام تک محدود رکھا گیا۔ اس کے بعد ٹیکنیکل تبدیلیوں نے ان صنعتوں میں عورتوں کے استعمال و روزگار پر غیر مساعد اثر ڈالا ہے۔ اس کے ساتھ دیہی صنعتوں کے انحطاط نے عورتوں کو روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد میں اپنی روزی کمانے کے لیے کھیتی باڑی کے کام میں ڈھکیل دیا ہے اور اس طرح ان کی تعداد اور فیصد اوسطاً بڑھتا رہا مگر ان کے روزگار اور کام کی سطحیں کم ہوتی رہی ہیں۔ دوسری طرف زندگی کے بڑھتے ہوئے مصارف، تعلیم اور شہری علاقوں میں سماجی تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممانعتیں جو اس سے پہلے اونچے طبقات کی عورتوں پر لگا دی گئی تھیں اب ہٹ گئی ہیں اور ان میں سے بعض اس قابل ہوگئی ہیں کہ وہ ان نئے پیشے یا کاموں میں جائیں جن کا تعلق تیسرے درجے کے سیکٹر سے ہے اور جن کے دروازے ان سے پہلے ان پر بند تھے۔

ترقی ونشوونما کے اس اختلافی اثر کے باعث خالص مقداری پیمانوں میں عورتوں کی اقتصادی شرکت کا ایک تفصیلی تجزیہ پوری داستان بیان نہیں کرسکتا۔ عورت کے معاشی رول کا کوئی بھی اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ مخصوص حصوں میں مرتب کرنے کے لیے اس کے سب رول الگ الگ کیے جائیں اور معاشی سماجی اور مقامی خصوصیات کی بنیاد پر نیز معاشی عمل کے ساتھ ان کی مطابقت کے درجے کی بنا پر ان میں فرق و امتیاز کیا جائے۔ اس طرح عورتوں کی شرکت کے مسائل کو سمجھنے میں سب سے بڑی دشواری اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ کام کرنے والی عورتوں کو ہم نوع افراد کے ایک گروپ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مفروضے نے، ان معلومات کو جو نتائج اخذ کرنے کے لیے جمع کی گئیں، ان قوانین اور حکمتِ عملیوں کو جو کام کرنے والی عورتوں کے لیے

جمع کی گئیں، ان قوانین اور حکمتِ عملیوں کو جو کام کرنے والی عورتوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے اختیار کی گئیں اور ان تصورات کو متاثر کیا ہے جو معیشت میں عورتوں کی شرکت کے متعلق عام طور پر لوگوں میں پائے جاتے تھے۔

ایک تفصیلی تجزیے سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ 1921 سے عورتوں کی معاشی واقتصادی شرکت انحطاط پر مائل رہی ہے اور یہ انحطاط دونوں طرح سے ہو رہا ہے۔ کل آبادی میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد 1911 میں 33.72 تھی جو 1971 میں صرف 11.86 فیصد رہ گئی۔ کمی کا یہ رجحان حالیہ چند سالوں میں اور بھی زیادہ بڑھا ہے۔ 1961-71 کے دوران مردوں اور عورتوں کی آبادی بالترتیب 25فیصد 24فیصد بڑھی (محنت کرنے والے گروپ میں 20فیصد اور 21فیصد) اور محنت کرنے والے مردوں کی تعداد 15.12 فیصدی بڑھی تو کام کرنے والی عورتوں کی تعداد 41.4 فیصد کم ہوگئی۔

اکثر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ان دو مردم شماریوں میں کام کرنے والوں کی تعداد میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں یہ انحطاط ان کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بنیادی طور پر مردم شماریوں میں مردوں کے کاموں اور روزگار کی سطح کو ناپا جاتا ہے اور گھر کی منتظمہ اور سودمند کام کرنے والوں کی حیثیت سے عورتیں جو قابل مبادلہ رول ادا کرتی ہیں ان کو نظرانداز کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ چونکہ ان میں سے بہت سی عورتیں بے تنخواہ کام کرنے والی ہوتی ہیں اس لیے کام کرنے والوں، کی تعریف سے ثانوی درجے کے کام کو خارج کردینے سے عورتوں کے کام اور روزگار کے اعداد وشمار کا ریکارڈ تیار کرنے پر برا اثر پڑتا ہے۔ 1971 میں جو مردم شماری ہوئی اس میں ایسی 23لاکھ عورتوں کو کام نہ کرنے والوں کے زمرے میں شمار کیا گیا جس سے درحقیقت کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا ہے۔ دوسرے یہ عام خیال ہے کہ 1961 کی مردم شماری میں ایک کام کرنے والے فرد کی جو تعریف معین کی گئی تھی وہ بہت وسیع تھی لیکن یہ دیکھا گیا کہ آندھرا پردیش، کرناٹک، اور تامل ناڈو کی ریاستوں کے علاوہ اور کسی جگہ نتائج اخذ کرنے کے لیے جمع کیے گئے اعداد وشمار میں اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ علاوہ ازیں 1961 کی مردم شماری میں کام کرنے والی عورتوں کی جو شرح 27.5 فیصد پیش کی تھی وہ اسی سال کیے گئے نیشنل سمپل سروے (National Sample Survey) کی پیش کردہ شرح (27.72فیصد سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس سے بدلتی ہوئی تعریفات کا اثر محض حاشیائی اور معمولی نوعیت کا ہے اور معیشت میں عورتوں کی زوال پذیر شرکت کا رجحان ایک مسلسل رجحان رہا ہے۔

مرد کام کرنے والوں کے مقابلے میں کام کرنے والی عورتوں کا تناسب

دیہی علاقوں کے اندر تمام زمروں میں اور شہری علاقوں کے اندر بیشتر زمروں میں کم ہوگیا ہے۔ معیشت میں مردوں اور عورتوں کی شرکت کی شرح میں سب سے کم عمر (یعنی صفر سے 14 سال تک کے) گروپ کے علاوہ باقی تمام عمر کے گروپوں میں بہت وسیع فرق رکھتی ہیں اور یہ فرق دیہی علاقوں کے مقابلے میں شہری علاقوں میں کہیں زیادہ ہے۔ 1961 سے کام کرنے والی عورتوں کی تعداد میں یہ کمی تمام عمر کے گروپوں میں واضح ہے۔ کام کرنے والی عورتوں کی فیصد تعداد میں یہ ہمہ گیر کمی اور انحطاط تمام ریاستوں کے اندر دیہی اور شہری دونوں طرح کے علاقوں میں نظر آتا ہے، لیکن شہری علاقوں میں یہ انحطاط زیادہ تیز ہے۔ مردم شماری نے کام کرنے والی عورتوں کی نوصنعتی زمروں میں جو تقسیم اختیار کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زراعت پر ان کا انحصار بڑھتا جارہا ہے اور صنعت اور ملازمت دونوں کے سیکٹر میں ایک کمی ہوتی جاتی ہے۔

کام کرنے والی عورتوں کے زمرے

ہماری تحقیقات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مردم شماری نے کام کرنے والی عورتوں کے جو زمرے مقرر کیے ہیں وہ نہ تو معیشت میں عورتوں کی شرکت کی حد اور نوعیت کے مناسب تعین کے لیے درحقیقت مفید ہیں اور نہ ان کے مسائل اور ان کی معذوریوں کی مناسب تشخیص کے لیے۔ اس لیے ہم نے ان کے کام اور روزگار کے سیکٹروں کے درجہ ''تنظیم'' اور مسائل کی نوعیت کے مطابق ان کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کر دیا یعنی غیر منظم سیکٹر اور منظم سیکٹر۔ ان دونوں سیکٹروں کے درمیان جو فرق ہے وہ کام کا فرق نہیں ہے۔ جیسا کہ زراعت، صنعت اور ملازمتوں کے درمیان ہو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ کام ان دونوں ہی سیکٹروں میں پائے جاتے ہوں۔ ان میں جو حقیقی فرق ہے وہ مضمر ہے۔ پیداوار تعلقات کی تنظیم میں، عوامی کنٹرول اور ضبط ونظم کے درجہ نفوذ دخل میں اور نتائج اخذ کرنے کے لیے اعداد وشمار جمع کرنے والے کارکنوں یا اداروں نیز سائنسی محققین کے ذریعے تسلیم شدہ ہوتے ہیں۔

منظم سیکٹر جدید پیداواری تعلقات کی خصوصیت کا حامل ہے اور اس کا ضبط ونظم ایسے قوانین کے ذریعے ہوتا ہے جو محنت کشوں کی سلامتی اور کام کے حالات کا تحفظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیز ایسی مزدور تنظیموں کے ذریعے جو اجتماعی سودا بازی کرنے کی اہلیت وقوت رکھتی ہیں اس میں ملازمتوں اور صنعتوں کا پورا پبلک سیکٹر بھی شامل ہے اور پرائیویٹ سیکٹر کا وہ حصہ بھی جو ضابطوں کے تحت کام کرتا ہے۔ غیر منظم سیکٹر جس میں زراعت، اور دوسری مختلف ومتعدد صنعتیں اور ملازمتیں شامل ہیں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ اس میں ان تمام حفاظتی تدابیر اور مشینری کا فقدان ہے۔ سماجی معاشی حالات اور کام کے مواقع کے متعلق معلومات بھی اس سیکٹر میں حد سے زیادہ قلیل و ناکافی ہیں۔ ہندوستان میں کام کرنے والی عورتوں کی حیثیت اس حقیقت سے واضح ہے کہ ان میں سے 94 فیصدی عورتیں غیر منظم سیکٹر میں پائی جاتی ہیں اور 6 فیصدی منظم سیکٹر میں۔

□□□

مسدود راہیں

ترجمہ وتعارف — زاہدہ زیدی

''مسدود راہیں'' میں پانچ اہم ترین جدید مغربی ڈراموں کا ترجمہ وتعارف زاہدہ زیدی نے پیش کیا ہے۔ زندگی اور موت، تلاش ذات، عرفان کائنات، تنہائی اور مابعد الطبیعیاتی خلا، انسانی صورت حال، لامحدود کائنات میں انسان کا مقام اور معنی کی تلاش جیسے گہرے اور بنیادی مسائل پر مبنی یہ ڈرامے فنی ندرت اور گہری معنویت کے باوصف جدید مغربی ڈراموں میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کا تعلق بیسویں صدی کے وسط میں ابھرنے والی ایک ایسی ڈرامائی تحریک یا اسلوب سے ہے جس نے جدید مغربی ڈرامے کو انقلاب آفریں تبدیلیوں سے روشناس کرایا اور ڈرامے کے وسیع تر امکانات کو بروئے کار لاکر وجودی تجربے کی گہرائی میں اترنے، لاشعوری کیفیات کو گرفت میں لانے اور ذہن انسانی کے اسرار ورموز کو منکشف کرنے کی کوشش کی۔

صفحات: 406، قیمت -/126 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبرنامہ

"مرقع چغتائی" پر نائب صدر جمہوریہ کا اظہار خیال

● حیدرآباد: نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے کہا ہے کہ شعر کو تصویر کے قالب میں ڈھالنا گویا تخیل کو گرفت میں لانا ہے۔ چغتائی کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے غالب کے اشعار کو ان کی تمام وسعت اور گہرائی کے ساتھ اپنے رنگوں میں جذب کرلیا ہے۔ آندھراپردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام جوبلی ہال میں منعقدہ ایک باوقار تقریب کے دوران مرقع چغتائی (دیوان غالب مصور) کی اشاعت نو کی رونما کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے نائب صدر نے مزید کہا کہ شعر ومصوری کے اس خوبصورت مرقع کی رونمائی آج اس شہر میں ہورہی ہے جہاں اس کی بنیاد پڑی تھی۔ انھوں نے کہا کہ 1928 میں سرعثمان علی خان نظام حیدرآباد کی ہنر پروری اور حوصلہ افزائی کے نتیجے میں نوجوان مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے غالب کی فکر کے "گلشن ناآفریدہ" کو اپنے قلم اور برش سے مجسم کرکے تقریباً ناممکن کام کو ممکن بنادیا تھا۔ نائب صدر نے اس موقع پر اے پی اردو اکادمی اور اس کے صدر رحیم الدین انصاری کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ہندوستان کے عظیم اور ہنرمند فنکار کے کام کی اہمیت کو سمجھا اور فکروفن کے اس لازوال شاہکار کی تجدید کی جو گزرنے والے سالوں کی گرد تلے دب کر دھندلا ہوچکا تھا۔ ریاستی گورنر نارائن دت تیواری نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ غالب کی شاعری معجزانہ کیفیات کی حامل ہے اور دنیا میں غالب کے پائے کا کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے۔ وزیراعلیٰ ڈاکٹر وائی ایس راج شیکھر ریڈی نے ریاستی حکومت کی جانب سے اردو زبان کی ترویج، اشاعت اور اس کی حوصلہ افزائی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کا تذکرہ کیا۔ اقلیتی بہبود کے وزیر سید محمد احمد اللہ نے حاضرین سے اظہار تشکر کیا۔ اس موقع پر ریاستی وزیر مسز گیتاریڈی رکن پارلیمنٹ انجن کمار یادو اور سابق وزیر محمد علی شبیر سمیت متعدد دانشور اور اردو دنیا کی اہم شخصیات بھی موجود تھیں۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل کے اہم اعلانات
سب کے لیے مفت اور لازمی تعلیم

● نئی دہلی۔ 7 جولائی، وزارت فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر کپل سبل نے آج راجیہ سبھا میں مفت اور لازمی تعلیم سے متعلق ایکٹ اور غیرملکی یونیورسٹی ایکٹ کے موضوع پر تمام سیاسی پارٹیوں کے اراکین سے اتفاق رائے پیدا کرنے کی اپیل کی۔ انھوں نے راجیہ سبھا کو بتایا کہ مفت اور لازمی تعلیم ایکٹ رواں اجلاس میں ہی پیش کیا جائے گا اور غیرملکی یونیورسٹیوں سے متعلق مسودہ بھی تیار ہے جسے منظوری کے لیے جلد ہی کابینہ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ مفت اور لازمی تعلیم سے متعلق ایکٹ کو ایوان میں منظور کرانے میں تمام پارٹیاں ان کی مدد کریں۔ انھوں نے کہا کہ اس ایکٹ کے منظور ہوتے ہی ملک میں نیبر ہڈ اسکول قائم ہوجائیں گے لیکن یہ اسکول کن علاقوں میں قائم ہوں گے اس کا فیصلہ ریاستی حکومتیں کریں گی۔

(اخبار مشرق، دہلی)

مدارس کے برخاست اساتذہ بحال ہوں گے

● نئی دہلی۔ 16 جولائی، وزارت فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر کپل سبل کے ساتھ میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ برخاست کیے گئے سبھی 9ہزار مدرسہ اساتذہ بحال ہوں گے جن کی تنخواہوں کا بجٹ جلد از جلد دے دیا جائے گا۔ پرانے اساتذہ میں سے جو نئی گائڈ لائن کے مطابق تعلیمی لیاقت رکھتے ہیں انھیں نئی شرح تنخواہ کے مطابق چھ ہزار اور بارہ ہزار دیے جائیں گے۔ بقیہ جو اساتذہ مطلوبہ تعلیمی لیاقت نہیں رکھتے انھیں پرانی شرح تنخواہ کے مطابق تین ہزار مشاہرہ دیتے ہوئے بی اے کرنے کے لیے چار سال کا موقعہ دیا جائے گا، اسکیم کے تحت جتنے بھی اساتذہ کا تقرر ہوچکا ہے کسی کو بھی ملازمت سے برطرف نہیں کیا جائے گا۔ یہ اطلاع ٹیچر ایسوسی ایشن مدارس عربیہ اترپردیش نے آج یہاں جاری ایک پریس ریلیز میں دی۔ وزیر موصوف نے اس موقع پر متعلقہ افسران کو ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ وفد سے میٹنگ کے دوران جو بھی باتیں طے ہوئی ہیں ان پر عمل درآمد کی کارروائی جلد از جلد کی جائے۔ ریلیز کے مطابق مرکزی عربی فارسی یونیورسٹی قائم کرنے کے مطالبے پر وزیر موصوف نے وعدہ کیا کہ مرکزی حکومت جلد از جلد اس مطالبے کو بھی پورا کردے گی۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

غریب طلبہ کو 25 فیصد ریزرویشن

● نئی دہلی۔ 21 جولائی، فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر کپل سبل نے آج کہا ہے کہ مفت اور لازمی تعلیم قانون بن جانے کے بعد اگر پرائیویٹ اسکول غریب اور کمزور طبقات کے بچوں کو داخلوں میں 25 فیصد ریزرویشن نہیں دیں گے تو سرکار اس اسکول کے خلاف قانونی کارروائی کرے گی۔ وقفۂ

سوالات کے دوران انھوں نے سماج وادی پارٹی کے جنیشور مشرا کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ملک میں 07-2006 میں ایک لاکھ 24 ہزار 313 پرائیویٹ اسکول تھے اور ان میں غریب طلبہ کے داخلوں کے قواعد وضوابط ریاستی سرکاریں بناتی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ اب مفت اور لازمی تعلیم کے قانون کی شکل اختیار کرنے کے بعد اگر کوئی اسکول غریب اور کمزور طبقات کے 25 فیصد بچوں کو داخلہ نہیں دیتا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی اور اس کا رجسٹریشن منسوخ ہوسکتا ہے۔ یہ پوچھے جانے پر کہ دہلی ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ اگر پرائیویٹ اسکول 15 فیصد سیٹیں غریبوں اور کمزور طبقات کے بچوں کے لیے ریزرو نہیں کرتے تو ان کی زمین کی الاٹمنٹ منسوخ ہوسکتی ہے مسٹر سبل نے کہا کہ ہائی کورٹ کا فیصلہ راجدھانی دہلی کے لیے ہے جب کہ یہ قانون الگ ہے۔ کانگریس کے راجیو شکلا نے جب یہ دریافت کیا کہ پرائیویٹ اسکول غریب بچوں کو مفت داخلہ دیتے ہیں تو اس کا ازالہ دوسرے بچوں کی فیس بڑھا کر کرتے ہیں ایسے میں سرکار مفت اور لازمی تعلیم قانون کے تحت کیا کرے گی۔ فروغ انسانی وسائل کے وزیر کپل سبل نے کہا کہ پرائیویٹ اسکول جب 25 فیصد سیٹیں غریب اور کمزور طبقات کے بچوں کو دیں گے تو سرکار اس کے مصارف خود برداشت کرے گی اور اسکولوں کو ادائیگی کرے گی۔

(صحافت، دہلی)

ملک کو ''ایجوکیشنل ہب'' بنانے میں مدد کی اپیل

● نئی دہلی۔ 24 جولائی، فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر کپل سبل نے 21 ویں صدی میں ہندوستان کو ''ایجوکیشن ہب'' بنانے میں ریاستوں سے مدد طلب کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاستیں 3 ماہ میں اپنے نظریات یا موقف پیش کریں کہ وہ تعلیم میں کس طرح کی تبدیلی چاہتی ہیں، ان کے یہاں کتنے کالج ہیں، ان کا معیار کیا ہے اور ان میں وہ کیسی اصلاح چاہتی ہیں، آنے والے سالوں میں ان کا بجٹ کیا ہوگا اور اعلیٰ تعلیم میں داخلے کا فیصد کتنا بڑھ سکے گا، اس کے بعد ہی مرکز تعاون کرسکے گا۔ سبل نے اپنے 100 دن کے ایجنڈے کو نافذ کرنے کی سمت میں ایک اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے ریاستوں کے اعلیٰ تعلیم اور تکنیکی تعلیم کے سکریٹریوں کے ساتھ میٹنگ کی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ ترقی پذیر ممالک میں ہائر ایجوکیشن میں داخلے کا فیصد 50 سے 70 فیصد ہے جب کہ پوری دنیا کا اوسط 27 فیصد ہے اور ہم 11 ویں پنج سالہ منصوبے کے آخر تک 15 فیصد کا ہدف حاصل کریں گے۔ 2020 تک ہمیں 30 فیصد ہدف حاصل کرنا ہوگا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''اگنو'' کے اردو سرٹیفکیٹ پروگرام کا افتتاح

● نئی دہلی۔ 24 جولائی، اقلیتی امور کے مرکزی وزیر سلمان خورشید نے آج یہاں اندرا گاندھی یونیورسٹی (اگنو) کے اردو سرٹیفکیٹ پروگرام کا افتتاح کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر اگنو نے اردو کے فروغ کے لیے جو قدم اٹھایا ہے وہ دوررس نتائج کا حامل ہوگا۔ اس پروگرام میں جلد ہی جو نصاب شامل کیے جائیں گے ان میں سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، بی.اے.، ایم فل.، پی.ایچ.ڈی. شامل ہیں۔ سرٹیفکیٹ پروگرام ان اردو ہندی بولنے والے لوگوں کے لیے ہے جو اردو پڑھنے لکھنے کے ساتھ صحیح اردو بولنا سیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ پروگرام میڈیا کے لوگوں کے علاوہ وکیلوں، سرکاری افسران، سفارت کاروں اور دوسرے پیشہ ور لوگوں کے لیے مفید رہے گا۔ تحقیقی کام کرنے والے بھی اس پروگرام سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ یہ پروگرام اردو اور ہندی کے بیچ خلیج کو پاٹنے اور برصغیر کے ملکوں میں رابطے کی بنیاد فراہم کرنے میں بھی معاون رہے گا۔ سرٹیفکیٹ سے ڈپلوما، بی.اے.، ایم.اے.، ایم فل. اور پی.ایچ.ڈی. اردو کا یہ پروگرام مدرسے کے طلبہ کے لیے بھی مفید رہے گا جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں گے۔ اسی ماہ سے شروع اس پروگرام میں 2010 اور 2011 تک ڈپلوما اور بی.اے. کی تعلیم بھی شروع کردی جائے گی۔ حال ہی میں یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے ایم فل. اور پی.ایچ.ڈی. پروگرام کو بھی منظوری دے دی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

لوک سبھا میں اردو کی گونج

● نئی دہلی۔ 4 اگست، فروغ وسائل انسانی کی وزیر مملکت محترمہ ڈی پورن دیشوری نے آج لوک سبھا میں ملن دیوڑا کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ سرکار کو اردو اسکولوں میں تربیت یافتہ اردو اساتذہ اور نصابی کتابوں کی کمی کا کوئی علم نہیں ہے۔ کیونکہ عموماً یہ اسکول ریاستی سرکاروں کے زیر انتظام ہوتے ہیں۔ واضح ہو کہ جناب ملن دیوڑا نے سوال کیا تھا کہ ملک کے اردو اسکولوں میں تربیت یافتہ اردو اساتذہ اور نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (این سی ای آر ٹی) کی ترجمہ شدہ نصابی کتابوں کی کمی کی شکایت کی گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو نصابی کتابوں کی کمی پر قابو پانے کے لیے این سی ای آر ٹی نے کیا انتظامات کیے ہیں اور سرکار نے تربیت یافتہ اردو اساتذہ کی کمی دور کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں۔ نیز یہ کہ کیا نئے تربیت یافتہ اردو اساتذہ کی بھرتی کی کارروائی کی جارہی ہے اور اردو کتابوں کے ترجمے کے کام میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو اکادمی کا کیا رول رہا ہے۔ وزیر موصوفہ نے اس طویل سوال کے جواب میں کہا کہ این سی ای آر ٹی کی جانب سے قومی نصابی تعلیم 2005 کے تحت پہلی کلاس سے 12 ویں کلاس تک کی کتابیں تیار کرکے اردو اکادمی دہلی کی معرفت مہیا کرائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں اردو اکادمی کو این سی ای آر ٹی کی اردو نصابی کتابوں کے قومی تقسیم کار کی حیثیت حاصل ہے۔

علاوہ ازیں یہ اردو کتابیں این سی ای آر ٹی کے سیلس کاؤنٹروں پر بھی دستیاب ہیں۔ نئے اردو اساتذہ کی بھرتی کے سلسلے میں محترمہ پورن دیشوری نے بتایا کہ نئے استادوں کی بھرتی دراصل ریاستی سرکاروں کی ذمے داری ہے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کو این سی ای آر ٹی کی نصابی کتابوں کے ترجمے، ان کی تدوین اور ان کی پروف ریڈنگ کی ذمے داری تفویض کی گئی تھی۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

دہلی اردو اکادمی کی نئی مجلس عاملہ کی پہلی غیر رسمی میٹنگ

● نئی دہلی۔ 17 جولائی، اردو زبان و ادب کی خستہ حالی کا احساس مجھے ہے کہ وہ کن مشکلات سے دوچار ہے۔ اردو کی ترویج و توسیع کے لیے کیا اقدام کرنے ہیں اس کا بھی خاکہ ذہن میں ہے اور اسی بنیاد پر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں دو سال زندہ رہ گیا تو اردو زبان کو گلی گلی اور گھر گھر پہنچاؤں گا۔ ان خیالات کا اظہار دہلی اردو اکادمی کے نئے کارگزار وائس چیئرمین سید شریف الحسن نقوی نے کیا۔ وہ دہلی اردو اکادمی کی نئی مجلس عاملہ کی تشکیل کے بعد پہلی غیر رسمی میٹنگ میں بطور میزبان ممبران کو خطاب کر رہے تھے۔ قبل ازیں شریف الحسن نقوی سمیت تمام ممبران نے اپنا مختصر تعارف پیش کیا۔ پروفیسر عتیق اللہ، سید پرویز، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، بلراج کومل، نرل سنگھ، مخمور سعیدی، دھرمیندر ناتھ، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر خواجہ اکرام، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر شاہد پرویز، معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر نگار عظیم، پروفیسر عبدالحق وغیرہ نے شرکت کی جبکہ سابق ممبران میں معروف افسانہ نگار رتن سنگھ، پروفیسر شمس الحق عثمانی، شمس رمزی، نجیب اختر وغیرہ شریک ہوئے۔ اس موقع پر سابق وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس (مرحوم) کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دو منٹ کے لیے خاموشی اختیار کی گئی اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کا عہد دوہراتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اردو کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے رتن سنگھ نے کہا کہ اردو کے لیے یہ بہت ہی مشکل دور ہے۔ میں یہ بات شاعری کے تعلق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن فکشن کی جو صورت حال ہے وہ بہت خراب ہے۔ آج جو بھی فکشن نگار ہے وہ 50 سال کے آس پاس کا ہے۔ اس لیے میری اکادمی سے گزارش ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پہنچ کر تلاش کرے۔ مخمور سعیدی نے کہا کہ بہ حالات موجودہ ہمیں سب سے زیادہ تعلیمی سرگرمیوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج پرائمری سے لے کر 8ویں تک اردو بالکل نہیں پڑھائی جارہی ہے تو سوال یہ ہے کہ جب اردو میں ابتدائی تعلیم ہی نہیں ملے گی تو اعلیٰ تعلیم کون حاصل کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو معاشرہ ختم ہوگیا ہے جسے دوبارہ بحال کرنے کی ذمے داری ہم سب کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ رتن سنگھ صاحب کی پریشانی کا حل بھی اسی میں ہے کہ اردو تعلیم کے نظام کو موثر بنایا جائے۔ اس موقع پر ہمارا سماج نے ممبران اور وائس چیئرمین سے بھی بات کی۔ ختم کیے گئے ایوارڈز کے سلسلے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے شریف الحسن نقوی نے کہا کہ ایوارڈ کا مسئلہ صرف اردو کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہر زبان کا ہے لیکن اردو والوں کو اس کی تکلیف ہے جس کا احساس مجھے ہے اور میں شروع سے اس سلسلے میں آواز بلند کر رہا ہوں۔ میری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد قلمکاروں کو ایوارڈ تقسیم کیے جائیں۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

پریم چند کی سماجی فکر کا احساس وقت کی ضرورت

● علی گڑھ۔ 4 اگست، پریم چند کے 129 ویں یوم پیدائش کے موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے سربراہ پروفیسر ایم ای زبیری کی رہائش گاہ پر جنوادی لیکھک سنگھ کے زیر اہتمام ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا جس کا آغاز کرتے ہوئے سکریٹری پروفیسر پردیپ سکسینہ نے کہا کہ آج کے پرآشوب دور میں پریم چند کی فکر کو بچا کر لے چلنا بڑی بات ہے۔ ڈاکٹر نمیتا سنگھ نے ''گھر'' عنوان سے ایک کہانی پیش کر کے پریم چند کو یاد کیا۔ ڈاکٹر پریم کمار نے کہا کہ ہم نے ادب میں سیاست کا پاکھنڈ اختیار کرلیا ہے جبکہ پریم چند کی تحریریں ہی انھیں بڑا بناتی ہیں۔ وہ اپنی فکر اور اپنے سروکاروں کی وجہ سے جدید دور کے کبیر ہیں۔ ڈاکٹر تسنیم سہیل نے پریم چند کو یاد کرتے ہوئے ڈاکٹر نمیتا سنگھ کی کہانی پر اپنے خیالات پیش کیے۔ پروفیسر ایم ای زبیری نے مشورہ دیا کہ ہم لوگوں کو نئی توانائی کے ساتھ منصوبہ بند طریقے سے پریم چند کی فکر کو فروغ دینا چاہیے۔ شعبۂ ہندی کے ریسرچ اسکالر یوگیندر نے ''گئودان'' کے مل مزدوروں کی حالت کو یاد کرتے ہوئے آج کے مزدوروں کی حالت کا ان سے تقابل کیا۔ ریسرچ اسکالر آدتیہ نے کہا کہ بات خواتین کے تئیں حمایت کی نہیں بلکہ آدھی آبادی کی حقیقت کو پیش کرنے کی ہے۔ شاید پریم چند آج ہوتے تو ایسا ہی لکھتے۔ ڈاکٹر عاشق علی نے پریم چند کے دور کے کسان اور آج کے کسانوں کے مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند کے کسان ایک ساتھ کھڑے ہیں جبکہ آج کا کسان تنہا ہے، وہ آج خودکشی کر رہا ہے۔ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر قاضی عبدالستار نے کہا کہ وقت بدلا ہے تبدیلیاں آئی ہیں۔ آج دیہاتوں میں خوش حالی آئی ہے۔ آج مسائل دوسرے ہیں۔ آج کا کسان صارفین کلچر کا شکار ہے اور اپنی زمین بیچ کر بے دخل ہورہا ہے، اس کے شعور میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ عصمت مسلسل خواتین کی حمایت میں لکھتی رہیں لیکن آج صورت حال بدلی ہے، خواتین کی حالت بھی بدلی ہے۔ پروفیسر کنور پال سنگھ نے پریم چند کو مہاجنی اور دولت مند تہذیب کا

سخت مخالف قرار دیا۔ انھوں نے نئے مصنفوں کو مشورہ دیا کہ وہ پریم چند کے فن سے سیکھنے کی کوشش کریں۔ ڈاکٹر راجیولوچن ناتھ شکل نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم پریم چند کو یاد کرتے ہیں تو ان پر کوئی احسان نہیں کرتے اور اگر یاد نہیں کرتے تو یہ ہماری نالائقی ہے۔ مذاکرے میں پروفیسر طارق چھتاری، انوراگ مشرا، محترمہ فرحہ زبیری، ڈاکٹر رمیش کمار وغیرہ موجود تھے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر پردیپ سکسینہ نے انجام دیے۔

(صحافت، نئی دہلی)

پریم چند سماجی سروکار کے فنکار

● دربھنگہ۔ 31 جولائی، عالمی ادب میں اس وقت تک پریم چند کی معنویت برقرار رہے گی جب تک ادب میں سماجی سروکار کی تلاش کی ضرورت محسوس کی جاتی رہے گی۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ادیب و ناقد اور پرنسپل ملت کالج دربھنگہ، ڈاکٹر مشتاق احمد نے کیا۔ ڈاکٹر مشتاق کالج کے شعبہ اردو و ہندی کے زیر اہتمام یوم پریم چند کے موقع پر منعقد ''پریم چند اور سماجی سروکار'' کے عنوان پر اپنا صدارتی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ موصوف نے کہا کہ پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے مشترکہ فنکار ہیں۔ انھوں نے صرف اردو اور ہندی زبان و ادب کا اعتبار نہیں بڑھایا بلکہ ہندوستانی ادب کی شناخت عالمی ادب میں مستحکم کی۔

آغاز میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر الیاس نے پریم چند کی اردو تخلیقات اور صدر شعبۂ ہندی ڈاکٹر موہت ٹھاکر نے پریم چند کی ہندی ناول نگاری پر تنقیدی روشنی ڈالی۔ مذاکرے میں ڈاکٹر افتخار احمد، ڈاکٹر نسیم سلطانہ، ڈاکٹر وجے مشرا اور ڈاکٹر وجیہہ احمد خان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور پریم چند کو ہندوستانی ادب کا معمار قرار دیا۔ (اخبار مشرق، نئی دہلی)

متھلا یونیورسٹی کے آٹھ کالج اردو کی تعلیم سے محروم

● دربھنگہ۔ 28 جولائی، اردو کا دم بھرنے والی موجودہ نتیش حکومت میں بھی ایل این متھلا یونیورسٹی کے 8 کالجوں میں ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا استحصال جاری ہے۔ ان کالجوں میں نہ تو اردو اساتذہ کے عہدے منظور ہیں اور نہ اردو پڑھنے والے مسلم طلبہ و طالبات موجود ہیں۔ اس سے متعلق متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی سرگرم نہیں ہیں۔ اگر سابق وائس چانسلر نے حکومت بہار کو ان 8 کالجوں میں اردو کے عہدے منظور کیے جانے کی گزارش تحریری طور سے کی بھی ہے، تو ان کی گزارش حکومت بہار کی عدم توجہی اور لال فیتہ شاہی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اردو کے ساتھ ہو رہے اس امتیازی سلوک کے خلاف کسی سیاسی لیڈر یا اردو کا دم بھرنے والے افراد نے کبھی آواز بلند نہیں کی ہے۔ ایل این متھلا یونیورسٹی کے قلب کی حیثیت رکھنے والا سی ایم سائنس کالج (دربھنگہ) جہاں 40 فیصد طلبہ و طالبات مسلم ہیں۔ اس کالج میں اردو کے اساتذہ کے عہدے منظور نہ ہونا یا اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہ کیا جانا اردو کے ساتھ خوبصورت مذاق ہے۔ اس کے علاوہ مارواڑی کالج (دربھنگہ) ایم کے کالج لہریا سرائے، ایم ایل ایس کالج سرسوپائی (دربھنگہ) ایل این جنتا کالج جھنجھار پور، مدھوبنی آر سی این کالج منجھول بیگوسرائے، ڈی بی کے این کالج نرائن سستی پور وی ایس جنتا کالج راج نگر مدھوبنی میں اردو کے اساتذہ کے عہدے منظور نہیں ہیں۔ جبکہ ایل این متھلا یونیورسٹی کے متعدد کالجوں میں ڈیڑھ درجن سے زائد منظور شدہ اردو کے عہدے خالی پڑے ہیں۔ ان پر تقرری عمل نہیں آ رہی ہے۔ واضح رہے کہ اگر مذکورہ مطالبات پر حکومت بہار سنجیدگی سے غور کرتی ہے تو اردو کے ساتھ کچھ حد تک انصاف کیا جا سکے گا اور امید ہے کہ حکومت سنجیدگی سے ضرور غور کرے گی۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

زبان سے محبت کے بغیر ترقی ممکن نہیں

● نئی دہلی۔ یکم اگست، اگر کوئی قوم اپنی زبان سے صرف اس لیے محبت نہیں کرتی، کیونکہ وہ روزی روٹی سے جڑی ہوئی نہیں ہے تو اس کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ ہمیں کسی کی طرف دیکھے بغیر اردو کو خود زندہ رکھنا ہے۔ یہ باتیں نامور صحافی شاہد صدیقی نے مظفر یہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقدہ فروغ اردو کانفرنس اور طلبہ و طالبات کے لیے جلسہ تقسیم انعامات میں کہیں۔ اس موقع پر ہمارا سماج کے ایڈیٹر خالد انور نے اردو زبان کے تعلق سے سرکار کی بے حسی پر ماتم کرنے کے بجائے اردو والوں کو خود جد و جہد کرنے پر زور دیا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ کم مائیگی کے باوجود ہمارے بچے اردو زبان میں ترقی کے منازل طے کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر امام الدین ذکائی کا کہنا تھا کہ ہم جس زبان کے مالک ہیں ہمیں اس کی خدمت پر فخر ہونا چاہیے۔ کفیل احمد انصاری نے اردو اسکولوں کے تعلق سے دہلی سرکار کی سرد مہری پر تنقید کی۔ مسٹر دلشاد احمد قمر مظاہری نے ٹرسٹ کے مقاصد بیان کیے۔ انعامات حاصل کرنے والوں میں 16 اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ و طالبات میں دسویں کے عائشہ علیم، محمد شیزان، بشریٰ پروین، بشریٰ ظہور، محمد سلمان، احمد سعد، سعدیہ، معراج عالم صدیقی، مہوش، محمد سہیل، خوشنما، سعدیہ پروین، محمد خضر، اقبال سیفی، خورشید احمد، سعد پرویز شامل تھے، جبکہ بارھویں کے طلبہ و طالبات میں شاہین یونس، محمد فیضان، ثنا سلطان، عائشہ خاتون، محمد وسیم ملک، فقیہا، ہما پروین، محمد عادل انصاری، صائمہ ہارون، سمرین صدیقی، ہما پروین، مریم پروین، مشا صابرین،

ثانیہ، محمد عمر ملک اور محمد ثاقب شامل تھے۔ علاوہ ازیں حفاظ کرام کو بھی انعامات سے نوازا گیا۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

"جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ" پر مذاکرہ

● بتیا۔ اردو گرلس ہائی اسکول (امام باڑہ) بتیا کے ہال میں منعقدہ ایک روزہ جلسے میں ڈاکٹر مولا بخش کی کتاب "جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ" پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر زبیر احمد نے کی اور نظامت کے فرائض محمد مختار وفا نے انجام دیے۔ اس مذاکرے میں شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، دہلی میں لکچرر ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے "جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر مولا بخش کی یہ کتاب اردو تنقید کو ایک نئے دور میں داخل کرتی ہے، جس میں گوپی چند نارنگ کی تنقیدی بصیرت پر بھرپور اور مدلل رائے کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی نیز کلیم الدین احمد وغیرہ کا بھرپور محاکمہ کیا گیا ہے۔ ابوظہیر ربانی نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ کتاب کا نام "جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ" کیوں ہے اور کہا کہ چونکہ گوپی چند نارنگ مابعد جدیدیت کے نظریہ ساز ہیں اس لیے گوپی چند نارنگ کو مرکز میں رکھے بغیر جدید ادبی تھیوری پر کوئی بھی بحث یا تھیسس لاحاصل ہوگی۔ محمد مختار وفا اور منظر سلطان نے کہا کہ میں اس کتاب کو اردو تنقید کی ایک اہم کتاب سمجھتا ہوں۔

پروگرام کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر مولا بخش نے چمپارن کی ادبی صورت حال پر خطبہ پیش کیا اور کہا کہ ادب اپنی تہذیبی جڑوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ادب کا مطالعہ تہذیب کے تناظر میں ہی کیا جانا چاہیے۔ اس لحاظ سے اردو کا جن زبانوں اور کلچر سے تعلق ہے اس کی انفرادیت یا تشخص کو منہا نہیں کیا جاسکتا۔ چمپارن بھی اردو کے اہم علاقوں میں سے ایک ایسا مقام ہے جہاں میر تقی میر کے ہم عصر سعداللہ گلشن (1715-1800) نے اردو شعروادب کا چراغ روشن کیا تھا، آج بھی وہ چراغ جل رہا ہے۔ چمپارن کے شعرا کی غزلوں میں مقامی اور ذیلی کلچر اور اس کے تشخص کے مسئلے کے ساتھ ساتھ مابعد جدیدحسیت مثلاً حاشیہ اور مرکز کے کھیل، اقلیتی مسائل، سیاست کی تجارت اور اس کے جبر تلے سسکتے ہوئے عام انسان کے دکھ درد کا مضمون ابھرتا ہے۔ نیز اس بات کی وضاحت کی کہ ہر عہد میں ادب کسی نہ کسی صورت میں مختلف تھیوریز سے متاثر رہا ہے اور تھیوری ادب کی فہم وتفہیم میں معاون ثابت ہوئی ہے۔

تقریب کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر زبیر احمد نے کہا کہ "جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ" ایک قابل قدر کتاب ہے۔ میں ڈاکٹر مولا بخش کو اس کتاب کے لکھنے پر اپنی تہنیت پیش کرتا ہوں۔ اخیر میں مذاکرے کے منتظم ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے تمام مہمانوں اور سامعین حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ شام میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر مولا بخش کے اعزاز میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت جناب تفضیل احمد نے کی اور نظامت کے فرائض جناب منظر سلطان نے انجام دیے۔ اس مشاعرے میں حسب ذیل شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا: ڈاکٹر مولا بخش اسیر، حسرت شادانی، تفضیل احمد، منظر سلطان، محمد مختار وفا، عبدالمجید خاں مجید، ابوالخیر نشتر، گورکھ مستانہ، ظفر امام، نوشاد احمد کریمی، مرزا کھورنج، افتخار احمد کریک، سریش گپت، کشوری لال انشومالی، قمرالزماں قمر، رؤف الاعظم اثر، اختر حسین اختر، شمیم افضل اور آزاد اظہر۔ (ڈاک سے)

اردو میڈیم کے 12-10ویں کے ٹاپرس کو ایوارڈ

● نئی دہلی۔ 29 جولائی، علامہ رفیق ٹرسٹ کے زیراہتمام ہندی بھون میں منعقد ایک پروگرام میں اردو میڈیم اسکولوں کے 10ویں اور 12ویں کلاس کے ٹاپرس طلبہ کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول، شفیق میموریل سینئر سیکنڈری اسکول، قومی سینئر سیکنڈری اسکول، علامہ رفیق دومین پولی ٹیکنک، ذاکر حسین کالج، مدرسہ عالیہ فتح پوری کے ہونہار طلبہ اور طالبات کو ان کی کارکردگی پر انعامات سے نوازا گیا۔ جن طلبہ کو انعام ملے ان میں حسیب احمد، محمد تقی، محمد مزمل، محمد یحییٰ، محمد شفیق شامل ہیں۔ مہمان خصوصی کے طور پر ظفر اقبال (آئی ایس) اور اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین شریف الحسن نقوی نے شرکت کی۔ اس موقع پر ظفر اقبال نے کہا کہ بچوں کو اے پی جے عبدالکلام سے تحریک لینی چاہیے کہ وہ کس خاندان میں پیدا ہوئے اور کس عروج تک پہنچے۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین شریف الحسن نقوی نے حکیم عبدالحمید کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب نے 100 روپئے اپنی والدہ سے اور 100 روپئے اپنے ایک دوست سے قرض لیے تھے اور انتقال سے قبل چار ہزار کروڑ روپئے کی مالیت کے تعلیمی ادارے قائم کرکے گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں حکیم عبدالحمید کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اپنی ذاتی زندگی پر حکیم صاحب زیادہ خرچ نہیں کرتے تھے۔ علامہ رفیق ٹرسٹ کے سکریٹری مقصود احمد نے نظامت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں حکومت کی تمام فلاحی اسکیموں کو عوام تک پہنچانے کی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے ممبر سردار پسپندر سنگھ نے کہا کہ اقلیتوں کے لیے جو فلاحی اسکیمیں مرکزی حکومت نے اور حکومت دہلی نے بنائی ہیں وہ سرکاری سطح پر نافذ نہیں ہوسکتیں اس کے لیے علامہ رفیق ٹرسٹ کی طرح بہت سے اداروں کو حکومت اور عوام کے بیچ میں ایک پل کا کام کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ کمیشن کے ہی ممبر آرنالڈ جیمس نے علامہ رفیق ٹرسٹ کے سکریٹری مقصود احمد کی محنت اور لگن سے کام کرنے کی

ستائش کی۔ پروگرام کی صدارت علامہ رفیق ٹرسٹ کے چیئرمین غلام جیلانی صدیقی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہمیں محنت اور مشقت کر کے حکومت میں حصہ داری لینی ہے۔ اس موقع پر علامہ رفیق ٹرسٹ کے زیر اہتمام سلائی کڑھائی کا کورس مکمل کرنے والی سلطانہ، ہما، فرحانہ، زیبہ سامیہ، کمپیوٹر کورس کرنے والی نصرت جہاں کو بھی انعامات سے نوازا گیا جبکہ کرکٹ میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے پر ذاکر کو خصوصی انعام دیا گیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رضیہ سلطان اور یاقوت کی قبریں

● جے پور۔ 3 اگست، آٹھ سو سال قبل ترک نسل کی پہلی خاتون حکمراں رضیہ سلطان کی قبر اگرچہ دہلی کے ترکمان گیٹ میں موجود ہے لیکن اردو کے ایک لیکچرر سید صادق علی نے دعویٰ کیا ہے کہ رضیہ سلطان اور ان کے مبینہ عاشق اور سپہ سالار جلال الدین یاقوت کی قبریں ٹونک کے ایک ویران مقام پر دریافت ہوئی ہیں۔ راجستھان سرکار کی وزیر سیاحت بینا کاک نے اس معاملے میں تحقیقات کا حکم دے دیا ہے کہ تاریخی شواہد حاصل کر کے ان قبروں کی اصلیت معلوم کی جائے۔ اگر ٹونک کی مذکورہ دونوں قبریں رضیہ سلطان اور یاقوت ہی کی ہیں تو ترکمان گیٹ میں جو دو قبریں ہیں وہ کس کی ہیں؟ ٹونک میں دو قدیم قبروں کی دریافت کے بعد ان پر مڑھے ہوئے پتھروں کو صادق علی کتابت کا ایک منفرد اسلوب قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ رضیہ اور یاقوت کی قبروں کی شہادت اس تحریر سے ہوتی ہے جسے وہ بہت غور کرنے کے بعد پڑھ سکے ہیں۔ ان کے مطابق پتھروں پر لکھی عبارت یوں ہے "شہید محبت قوت الملک جلال الدین یاقوت" اسی قبر سے تقریباً تین فٹ کی اونچائی پر دوسری قبر ہے جس پر پتھر کی عبارت میں تحریر ہے "سلطان الہند رضیہ سلطان" صادق علی کا دعویٰ ہے کہ اس عبارت کو پڑھنا بے حد مشکل تھا، کیوں کہ پتھروں کو آڑے ترچھے انداز میں جما کر یہ عبارت لکھی گئی ہے، جسے انھوں نے انکل لگا کر پڑھ لیا۔ دریافت شدہ دو پکی قبروں کے درمیان پندرہ گز کا فاصلہ ہے۔ صادق علی کے دعوے کے مطابق پہلی قبر یاقوت کی ہے اور دوسری اونچی قبر رضیہ کی ہے۔ تاریخ کے مطابق رضیہ کے بھائی بہرام شاہ نے کیتھل میں ایک جنگ کے دوران رضیہ اور اس کے شوہر ملک التونیہ کو قتل کر دیا تھا اور دہلی کے ترکمان گیٹ میں انھیں دفن کر دیا تھا۔ ترکمان گیٹ میں ایک مقبرہ ہے جو آثار قدیمہ کے زیر انتظام ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دو قبروں میں سے ایک قبر رضیہ اور دوسری قبر ان کی بہن کی ہے۔ تاریخ کے مطابق بھٹنڈہ (پنجاب) کے حکمراں التونیہ نے رضیہ کے سپہ سالار اور افریقی نژاد عاشق جلال الدین یاقوت کو قتل کر کے رضیہ کو گرفتار کر لیا تھا۔

قیاس ہے کہ بعد ازاں رضیہ نے التونیہ سے شادی کر لی تھی اور سلطنت کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کے بعد کے واقعات کے مطابق رضیہ کے بھائی بہرام شاہ نے بھٹنڈہ پر حملہ کر کے رضیہ اور التونیہ کو قتل کر دیا تھا اور ان کی لاشوں کو کیتھل میں دفن کر دیا تھا۔ نئی تحقیق کے مطابق رضیہ کی موت محض 35 سال کی عمر میں ہوگئی تھی اور ان کی تدفین جے پور سے سو کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ٹونک میں ہوئی تھی۔ رضیہ کی موت اور ان کی تدفین کی تاریخ کے بارے میں کئی طرح کے اختلافات ہیں۔ مؤرخوں کے قیاس کے مطابق کیتھل میں رضیہ کی شکست اور موت کی تاریخ میں ایک روز کا فرق ہے۔ جبکہ سید صادق علی کا دعویٰ ہے کہ مؤرخوں کا قیاس غلط ہے، رضیہ اور یاقوت کی موت اور تدفین کے درمیان ایک مہینے کا وقفہ ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ کیتھل میں زخمی ہونے کے بعد رضیہ نے محفوظ مقام پر پہنچنے کے لیے اپنے معتمدوں کے ساتھ سفر کیا ہوگا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں ایک روایت ہے کہ رضیہ مرد کے بھیس میں فرار ہو کر راجستھان پہنچی تھی جہاں اسے پناہ مل گئی تھی، لیکن ہندو کسانوں نے اسے مار ڈالا تھا۔ سید صادق علی اس روایت کو درست نہیں مانتے ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ رضیہ اپنے سیکولر کردار کی وجہ سے عوام میں مقبول تھی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ رضیہ پہلی مسلم حکمراں تھی جس نے راجپوتوں کے ساتھ مل کر جنگیں لڑی تھیں۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ رضیہ کے والد التمش نے رنتھمبور کے قلعے پر حملہ کیا تھا جو ٹونک سے صرف پچاس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسی پہاڑی کی چوٹی پر التمش کی مسجد کے نام کی ایک مسجد آج بھی باقی ہے۔ رضیہ سلطان کی موت کے تعلق سے کوئی واضح شہادتیں نہیں ہیں۔ التمش اور رضیہ سلطان کے دور حکومت کے تعلق سے تاریخ میں کئی شگاف ہیں، اس لیے صادق علی کے قیاسات پر بھی اب بحث شروع ہوگئی ہے۔ البتہ دو باتیں غور طلب ہیں کہ اگر ٹونک کی قبریں رضیہ اور یاقوت کی ہیں تو التونیہ کی قبر کہاں ہے؟ اگر رضیہ زخمی ہو کر ٹونک آئی تھی تو کیا یاقوت بھی زخمی تھا؟ دونوں کی موت کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟ کیا یاقوت بعد میں فوت ہوا اور رضیہ کی قبر کے قریب دفنایا گیا؟ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ان کی تدفین کن لوگوں نے کی اور ان کی قبروں پر متذکرہ عبارتیں کس نے تحریر کرائیں؟ بہر حال تاریخ تو مدفون صداقتوں کی تلاش کا عمل ہے، لیکن نئی دریافت پر راجستھان کی وزارت سیاحت و آثار قدیمہ کی وزیر بینا کاک نے کہا ہے کہ "ان قبروں کو رضیہ اور یاقوت کی قبریں ثابت کرنے کے لیے ماہرین کو تاریخ کو اچھی طرح چھاننا چاہیے۔" راجستھان حکومت کی ان قبروں میں دلچسپی اس لیے بھی ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے تو راجستھان کو سیاحت کے اعتبار سے ایک اور اہم تاریخی مقام سیاحوں کو متوجہ کرنے کے لیے حاصل ہو جائے گا۔

(صحافت، نئی دہلی)

پٹنہ یونیورسٹی میں اردو جرنلزم کے تیسرے سیشن کا آغاز

● پٹنہ۔ 8 جولائی، شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام چلنے والے یک سالہ پروفیشنل کورس ''پی جی ڈپلوما ان اردو جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن'' کے تیسرے سیشن کا آغاز صدر شعبۂ اردو پروفیسر اعجاز علی ارشد کی صدارت میں منعقد افتتاحی تقریب میں ہوا، جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے علاوہ ریاض عظیم آبادی، راشد احمد، ایم ٹی خان، نریندر تیواری اور شان الرحمٰن نے شرکت کی۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے جو خود بھی اپنے شعبے میں دو سالہ جرنلزم کورس کے ڈائرکٹر ہیں، کہا کہ صحافت صرف پیشہ نہیں ایک ذمے داری کا نام ہے، اس لیے جو طلبہ یہ کورس کر رہے ہیں وہ سماج کے تئیں اپنی ذمے داریوں کو سمجھیں اور سماج کو بیدار کرنے کا فریضہ انجام دیں۔ انھوں نے طلبہ کو اپنی آنکھیں اور کان ہمیشہ کھلے رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے نئے علوم، نئی ایجادات بالخصوص انٹرنیٹ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے راستے بتائے۔

ہفت روزہ سیکولر محاذ کے ایڈیٹر ریاض عظیم آبادی، قومی تنظیم کے نیوز ایڈیٹر راشد احمد، پٹنہ ہائی کورٹ کے سابق راجسٹرار ایم ٹی خان اور معروف شاعر شان الرحمٰن نے بھی طلبہ سے خطاب کیا اور پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی۔ تقریب کی نظامت کورس کو آرڈینیٹر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کی۔

صدارتی تقریر میں کورس کے ڈائرکٹر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے طلبہ کو اس کورس کی افادیت بتائی اور انھیں ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ تقریب سے جرنلزم کے استاد ڈاکٹر نریندر تیواری نے بھی خطاب کیا اور ڈاکٹر اسرائیل رضا، استاد شعبۂ اردو نے شکریہ ادا کیا۔ شعبے کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات کے علاوہ عظیم آباد کی مختلف ادبی اور سماجی شخصیتوں نے شریک ہوکر اس افتتاحی تقریب کو رونق بخشی۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● نئی دہلی۔ 10 جون، دہلی اقلیتی کمیشن اور شعبہ اردو اور شعبۂ پنجابی، دہلی یونیورسٹی کے اشتراک سے اردو اور پنجابی زبانوں کے لیے دو روزہ کاؤنسلنگ اور ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو اور پنجابی زبان کے مسائل پر طلبہ وطالبات کے سوالوں کے جوابات متعلقہ افراد کے ذریعے فراہم کیے گئے۔ اس ورکشاپ میں بڑی تعداد میں اردو اور پنجابی کے طالب علموں نے اپنے کیریئر کے متعلق گفتگو کی۔ خاص طور پر 12 ویں جماعت پاس کرکے آنے والے طلبہ نے۔ ان بچوں کو بتایا گیا کہ تعلیم جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ روزگار کے بہت سارے مواقع موجود ہیں۔ آج کی دنیا میں اردو اور پنجابی سے متعلق مختلف میدانوں میں بہت سی جگہیں خالی پڑی ہیں، جن کے لیے خود کو تیار کرکے اپنا مستقبل سنوارا جاسکتا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے کالجوں میں اردو اور پنجابی زبانوں کے حوالے سے ان کے داخلے کے بہت سارے مسائل پر بھی گفتگو ہوئی اور انھیں ورکشاپ میں حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ بچوں کی جانب سے ان معلومات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (صدر شعبۂ اردو)، ڈاکٹر منجیت سنگھ (صدر شعبۂ پنجابی)، ڈاکٹر توقیر احمد خاں (سینئر ریڈر، شعبۂ اردو)، خالصہ کالج کے پرنسپل جسوندر سنگھ اور اقلیتی کمیشن کی جانب سے اس کے چیئرمین مسٹر کمال احمد فاروقی اور ممبران میں پشپیندر سنگھ اور آرنلڈ جیمس خصوصی طور پر شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ کثیر تعداد میں دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ نے بھی شرکت کی۔ (سالار، بنگلور)

● دیوبند۔ 13 جولائی، ''فروغ اردو اور قومی یکجہتی'' کے عنوان پر منعقدہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مدنی آئی ٹی آئی کے چیف کنٹرولر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری تو آرہی ہے مگر وہ کس طرح کی تعلیم حاصل کریں اس کا شعور بیدار نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بامقصد تعلیم کی جانب متوجہ ہوں اور اردو کی بقا و ترقی کے لیے دل و جان سے جدوجہد کریں۔ انھوں نے کہا کہ صحیح مضامین کے انتخاب کے لیے معاشرے کے ذمے دار افراد کو طلبہ سے کاؤنسلنگ کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر نواز نے اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ وطالبات کی تعلیم کے ساتھ تربیت کی جانب بھی توجہ دیں۔ جلسے کے صدر جین انٹر کالج کے سابق پرنسپل مہندر پال کامبوج نے کہا کہ جس ملک میں خواندگی نامکمل ہو وہ ملک کبھی ترقی یافتہ نہیں ہوسکتا۔ بھائیہ انٹر کالج کے سابق پرنسپل حاجی محمد عاقل نے تعلیم نسواں کو فروغ دینے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جب تک لڑکوں اور لڑکیوں میں بلاتفریق تعلیم کا رجحان عام نہیں ہوگا اس وقت تک خواندگی مشن کے ہدف تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ ان کے علاوہ ماسٹر شمشاد احمد راؤ عبدالستار اور لکشمی کانت نے بھی تعلیم کی اہمیت وافادیت پر اظہار خیال کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 18 جون، ہالینڈ کے مشہور ادیب فاروق خالد کے اعزاز میں گذشتہ روز منعقد ایک جلسے میں مہمان کا تعارف کراتے ہوئے آج کل کے مدیر خورشید اکرم نے کہا کہ فاروق خالد ایک اچھے افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ ان کی پہلی کہانی آج کل میں 1970 میں شائع ہوئی تھی۔ 1970 میں ان کے ناول سیاہ آئینے پر پاکستان کا آدم جی ایوارڈ ملا تھا۔ ان کے تین سفرنامے بھی شائع ہوئے ہیں۔ فاروق خالد ہالینڈ کے ادارۂ ترقیات تراجم ڈچ ادبیات سے وابستہ ہیں۔ غالب اکادمی میں منعقد اس تقریب میں فاروق خالد

نے افسانہ ''ایک'' سنایا، جس میں یورپین معاشرے میں نسلی پیچیدگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس افسانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ فاروق خالد نے اپنے افسانے میں نسل پرستی کے موضوع کو بڑے فلسفیانہ انداز میں ڈھالا ہے۔ اب کہانی میں تبدیلی آچکی ہے۔ کہانی میں بیانیہ اور فلسفیانہ ایک ساتھ پیش ہونے لگا ہے۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ موضوع کے اعتبار سے کہانی اہم ہے۔ فاروق خالد نے کہا کہ ہالینڈ میں اردو والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ تعلیم کا بندوبست نہیں ہے۔ اردو پڑھنے والے زیادہ تر تجارت پیشہ افراد ہیں۔ اردو والوں کا کوئی ادبی یا علمی حلقہ بھی نہیں ہے۔ چند ایک لوگ ہیں جن میں جمیل الرحمٰن کا نام بطور شاعر لیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہالینڈ میں ڈچ ادب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام تسلی بخش طریقے پر ہو رہا ہے۔ وہاں ایک اور قابل ذکر علمی کام یہ ہوا ہے کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی سولہ جلدیں ہالینڈ سے ہی شائع ہوئی ہیں۔ ہالینڈ کی لائبریریوں میں اردو کتابیں اور رسالے مل جاتے ہیں۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر ابرار رحمانی نے کی۔ جلسے میں انجم عثمانی، ذکیہ ظفر، نسیم عباسی، شاداب حسین، راشد حسین، ظہیر احمد برنی، ڈاکٹر عقیل احمد، جہان اردو کے ایڈیٹر ڈاکٹر مشتاق احمد وغیرہ نے شرکت کی۔

(سیاست، حیدرآباد)

● حیدرآباد۔ 19 جون، محفل خواتین پچھلے چالیس سال سے نہایت کامیابی سے چلنے والی حیدرآباد کی وہ واحد ادبی انجمن ہے جہاں خواتین کے ادبی ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔ اس ادبی انجمن سے وابستہ خواتین کی کاوشوں کو اور اس کی تاریخ کو کتابی شکل میں ضرور شائع کرانا چاہیے۔ ڈاکٹر نجمہ ظہیر باقر نے ان خیالات کا اظہار محفل خواتین کے ماہانہ ادبی اجلاس میں کیا جو 13 جون بروز ہفتہ منعقد کیا گیا تھا۔ نسیمہ تراب الحسن نے صدر اجلاس کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ دہلی سے تشریف لائیں ڈاکٹر نجمہ ظہیر باقر معروف افسانہ نگار علی باقر مرحوم کی شریک حیات ہیں اور خود ایک معروف سائنٹسٹ ہیں۔ لیکن علی باقر کی شریک حیات اور سجاد ظہیر اور رضیہ ظہیر کی بیٹی ہونے کے ناتے ان کا اردو ادب سے بھی بے پناہ لگاؤ ہے۔ ان کی موجودگی نے اس محفل کو وقار بخشا۔ ڈاکٹر سیدہ زہرہ (لکچرر ممتاز کالج) اور ہندی کی شاعرہ رتنا کلا مشرا مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شریک رہیں۔ ڈاکٹر زہرہ نے محفل خواتین کے چالیس سال مکمل ہونے پر مبارک باد دی اور کہا کہ ساری دنیا مصائب و آلام کا شکار ہے اور خواتین دوہرے مسائل کا شکار ہوتی ہیں۔ محفل خواتین جیسی خوشگوار ادبی محفل میں شرکت کرکے غم دوراں سے کچھ وقت کے لیے دور ہوجاتی ہیں۔ یہاں پیش کی جانے والی نثری تخلیقات میں عطیہ نورالحق قادری کا مضمون ''اے کاش ایسا ہوجائے'' عزیز محبوب کا ''چوہوں کی میٹنگ'' ثریا جبیں کا طنزیہ مضمون ''غائب دماغ لیڈر'' اور فاطمہ یزدانی کا افسانہ ''ایک فوجی کا خط'' بہت پسند کیے گئے۔ ناظم ادبی اجلاس محترمہ عزیز النسا صبا تھیں۔ محفل مشاعرہ میں محفل سے وابستہ شاعرات اسریٰ عمر، الزبیتھ کورین مونا، مشرف شہریار کاظمی، ریاض فاطمہ تشہیر، منورالنسا منور، نسیم نیازی، تسنیم جوہر، نسیمہ تراب الحسن، مظفر النسا ناز اور عزیز النسا صبا نے اپنا کلام پیش کیا۔ محترمہ مظفر النسا ناز ناظم مشاعرہ تھیں اور تسنیم جوہر کے شکریے پر محفل اختتام پذیر ہوئی۔ (منصف، حیدرآباد)

● بیگوسرائے۔ 13 جولائی، بیگوسرائے شہر میں اردو اکادمی کے تعاون سے غیر اردو داں افراد کے لیے اردو تعلیمی عشرے کی شروعات مقامی کارگل وجے بھون میں کی گئی جس کا افتتاح اے ڈی ایم عبدالحفیظ خان، ہیڈکوارٹر ڈی ایس پی ایم اے فاطمی، اے ڈی جے این پنڈت، ایل این ایم یو دربھنگہ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ظفر حبیب اور کوآپریٹو کالج کے اردو شعبے کے ہیڈ و بہار اردو اکادمی کے بیگوسرائے کے کنوینر پروفیسر شرف الدین نے مشترکہ طور پر کیا۔ اس موقعے پر ظفر حبیب نے کہا کہ اردو ہندوستان کی عوامی زبان تھی، ہے اور رہے گی۔ دنیا میں کروڑوں لوگ اردو زبان بولتے ہیں۔ اردو پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی یکجہتی کو بچائے رکھنے کے لیے اردو اور ہندی کو تقسیم ہونے نہیں دینا چاہیے۔ اردو دلوں کو جوڑتی ہے۔ اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ پہلے تمام لوگ اردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لیکن اب لوگوں نے اردو کو چھوڑ دیا ہے۔ اسی کے مدِنظر حکومت بہار نے اردو کے فروغ کے لیے پہل کی ہے۔ مہمان خصوصی عبدالحفیظ خان نے کہا کہ آج کے دور میں اردو کی تعلیم حاصل کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لیے گہرائی تک جانا چاہیے۔ انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس دور میں لوگ اپنی زبان کا بھی علم رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ اردو اور ہندی کے بیچ گہرا رشتہ ہے۔ یہاں زبان کی لڑائی نہیں ہونی چاہیے۔ ایم اے فاطمی نے کہا کہ اردو میں غضب کی کشش ہے۔ جو لوگ اردو کو اچھی طرح سے بولتے اور تحریر کرتے ہیں وہ کسی بھی زبان کو بولنے میں صحیح الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ پروفیسر شرف الدین نے کہا کہ 15 دنوں میں غیر اردو دانوں کو اردو کی ابتدائی خوبیاں بتائی جائیں گی۔ عمر کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس موقع پر ریٹائرڈ ایجوکیشن افسر محمد شمیم الحق، پروفیسر سمیع احمد، محمد محی الدین چاند، محمد منصور عالم ایڈووکیٹ، محمد نسیم اختر ایڈووکیٹ، ہارون رشید، دلیپ کمار سنہا، پرکاش کمار سنہا، محمد غفران سمیت درجنوں دانشور حضرات موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● بلرامپور۔ 3 اگست، پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ کسی بینک نے اپنے ATM سسٹم میں انگریزی، ہندی کے ساتھ اردو کو بھی جگہ دی۔ بلرامپور کے اسٹیٹ بینک نے یہ کام کیا۔ بینک کی اس پہل سے اردو دوستوں میں خوشی کی لہر پائی جاتی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اعزاز و اکرام

● نئی دہلی۔ 11 جولائی، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے زیر اہتمام کانسٹی ٹیوشن کلب میں منعقدہ اجلاس برائے تفویض انعامات میں ساتویں حضرت شاہ ولی اللہ ایوارڈ 2005 سے ممبر لاکمیشن آف انڈیا و سابق چیئر مین قومی اقلیتی کمیشن پروفیسر ڈاکٹر طاہر محمود کو سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ غلام ای وہن وتی اٹارنی جنرل آف انڈیا، راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئر مین کے رحمان خان کے ہاتھوں تفویض کیا گیا جو کہ ایک لاکھ روپے، مومنٹو اور ایک سپاس نامے پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ایوارڈ برائے بہترین مقالہ نگاری نیشنل لا یونیورسٹی اڑیسہ کے وائس چانسلر پروفیسر فیضان مصطفیٰ کو ممبر پارلیمنٹ اسرار الحق قاسمی کے ہاتھوں تفویض کیا گیا جبکہ اسی سلسلے میں دوسرا ایوارڈ آئی آئی ٹی لا اسکول بھونیشور اڑیسہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر افروز عالم کو تفویض کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر طاہر محمود نے اسلامی قانون پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ اصل اسلامی قانون دنیا میں بے مثال ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے والد کا احسان ہے کہ انھوں نے میری تعلیم انگریزی زبان کے ساتھ عربی، فارسی اردو میں بھی دلائی جس کے سبب مجھے اصل اسلامی قانون تلاش کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور میں نے اصل سورس تک پہنچنے کی کوشش کی۔ قرآن و حدیث کے علاوہ مختلف مسالک کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اسلامی قانون پر پڑھتے پڑھاتے اور لکھتے لکھاتے نصف صدی گزر گئی جس کے بعد کچھ چیزیں ایسی پیش کر سکا جس کی بنیاد پر اب تک سپریم کورٹ میں درجنوں فیصلے سنائے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسلامی قانون کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب کافی حد تک غلط فہمیاں دور ہوئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ طلاق کے مسئلے پر جتنی بہترین باتیں اسلامی قانون میں موجود ہیں ان کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اسلامی قانون میں عورت شادی کے بعد بھی اپنی قانونی حیثیت پر قائم رہتی ہے یہ تو مغربی طریقہ ہے کہ عورت کو شادی کے بعد اپنا نام تبدیل کرنا پڑتا ہے ورنہ اسلام میں اس کی کہیں کوئی نظیر نہیں ہے۔ اس موقع پر کے رحمان خان، غلام ای وہن وتی، ایس ایم شفیق، اسرار الحق قاسمی اور ڈاکٹر منظور عالم نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

(ڈاک سے)

● راجو پور۔ 20 جولائی، راجو پور ضلع سہارنپور کی ادبی انجمن فدایان اردو کے زیر اہتمام مشاعرہ ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو ان کی شعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں دیوبند نگر پالیکا کے چیئر مین جناب حسیب صدیقی نے مولانا کاشف اردو شاعری ایوارڈ سے نوازا جس کے تحت ان کی خدمت میں شال اور ایک مومینٹو پیش کیا گیا۔ اس موقع پر جناب حسیب صدیقی کے علاوہ جناب فاخر ادیب، جناب شمس دیوبندی، جناب اشرف عثمانی اور جناب وسیم راجو پوری نے بھی ڈاکٹر ماجد دیوبندی کا استقبال کرتے ہوئے ان کی شاعری پر اظہار خیال کیا مقررین کا تاثر تھا کہ آج کے اسلام مخالف ماحول کے باوجود ماجد دیوبندی نے اپنے کلام میں حدیث و قرآن کی تعلیمات کو پیش کر کے ان اقدار کو آگے بڑھایا ہے جو انھیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملی ہیں۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو دو سال قبل اہل دیوبند کی جانب سے فخر دیوبند کے ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

(ڈاک سے)

● معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسد اللہ کو گذشتہ دنوں، مہاتما پھولے بھارتیہ ملیٹینٹ ریسرچ اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر چندر موہن تلناتمک ساہتیہ راشٹریہ سمان سے نوازا گیا۔ مراٹھی ادب کے اردو تراجم اور تعارف کے لیے یہ اعزاز ناگپور میں منعقدہ ایک تقریب میں شری این این مورتی، سکریٹری، انٹرنیشنل ریسرچ فورم مینیجر فارچیں کے ہاتھوں دیا گیا۔

محمد اسد اللہ برصغیر میں انشائیہ نگاری کی تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے کے علاوہ امراٹھی زبان کے مزاحیہ ادب کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں بھی اہم خدمات انجام دے چکے ہیں۔ موصوف مولانا ابوالکلام آزاد جونیئر کالج، ناگپور، میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

نئے تنقیدی مسائل اور امکانات

● انجمن ترقی اردو ہند، شاخ کٹک اور فیضان ادب، کٹک کی جانب سے 19 اپریل 2009 کی شام کو مدرسہ مدینۃ العلم، کٹک کے ہال میں کرامت علی کرامت کی تازہ تنقیدی تصنیف ''نئے تنقیدی مسائل اور امکانات'' کی رسم اجرا عمل میں آئی جسے (پدم شری) شمس الرحمٰن فاروقی نے انجام دیا۔ صدارت پروفیسر قمر الدین خان نے فرمائی۔ سب سے پہلے خاور نقیب نے جناب فاروقی کی ادبی فتوحات پر روشنی ڈالی اور انھیں حکومت ہند کی جانب سے دو پدم شری کا خطاب ملنے پر اہل اڑیسہ کی جانب سے مبارکباد پیش کی۔ بعد ازاں سکریٹری سید نور الٰہی ناطق نے رپورٹ پیش کی۔ رسم اجرا کے بعد خاور نقیب نے کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ'' پروفیسر کرامت علی کرامت کی یہ نئی کتاب اردو کے تنقیدی ادب میں اہم اور خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔'' سید منظور احمد قاسمی نے کتاب پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کرامت علی کرامت کی تنقیدی کاوشوں کو سراہا۔ کرامت علی کرامت نے فاروقی کی ادبی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ'' میں شمس الرحمٰن فاروقی کو اس عہد کا نیاز فتح پوری سمجھتا ہوں۔ جس طرح نیاز صاحب نے'' نگار'' کے ذریعے کئی

پڑھیوں کے ادیبوں کی ذہنی پرورش کی، اسی طرح فاروقی نے بھی ''شب خون'' کے ذریعے کئی پیڑھیوں کی ذہنی نشوونما میں حصہ لیا۔ نیاز فتح پوری کی طرح فاروقی نے بھی شاعری، تنقید اور فکشن ان تینوں میدانوں میں صاحب کمال ہونے کا ثبوت دیا۔ جس طرح نیاز صاحب کو ہمارے ماضی کے کلاسیکل ادب اور کلچر سے بے پناہ دلچسپی تھی، فاروقی کو بھی اسی طرح ماضی کے ادب اور کلچر سے گہرا لگاؤ ہے۔''

بعدازاں جناب فاروقی نے اردو پر علاقائی زبانوں اور بولیوں کے اثرات پر عالمانہ تقریر کی۔ انھوں نے مختلف حوالوں اور دلیلوں سے واضح کیا کہ کسی علاقے کی بولی جانے والی زبان کو کسی دوسرے علاقے کی زبان پر کسی طرح فوقیت حاصل نہیں۔ انھوں نے پرانے اساتذہ کے متعدد اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے ایسے الفاظ کی نشان دہی کی جو اہلِ زبان کے نزدیک اب متروک ہو چکے ہیں، لیکن ان کا استعمال اب بھی مختلف علاقوں میں بولی جانے والی اردو میں نظر آتا ہے۔ سامعین کے اصرار پر جناب فاروقی نے اپنے چند اشعار سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔ (ڈاک سے)

دی ٹروتھ آف ٹیرارزم

● نئی دہلی۔ 28 جولائی، دہشت گردی کے لیے کسی طرح کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔ صلہ رحمی اسلام کا بنیادی اصول ہے اور امن و سلامتی اس کا پیغام۔ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے ہم سب کو مل جل کر لڑائی لڑنی ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار آج انڈیا انٹرنیشنل انیکسی میں اردو پریس کلب کے زیراہتمام ڈاکٹر حنیف ترین کی اردو نظموں کے انگریزی ترجمے پر مشتمل مجموعے ''دی ٹروتھ آف ٹیرارزم'' کے اجرا کے موقع پر مقررین نے کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ڈاکٹر حنیف ترین کی شاعری احتجاج کی شاعری ہے۔ عراق، فلسطین، افغانستان اور جہاں جہاں بھی انھیں دہشت گردی، فسطائیت، ناانصافی اور ظلم ہوتا ہوا نظر آیا، ان کے قلم نے احتجاج کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ اچھی بات ہے کہ حنیف ترین نے اپنی نظموں کو انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کیا تا کہ ان کی بات ان لوگوں تک بھی پہنچے جن کی وجہ سے دہشت گردی جنم لے رہی ہے۔

نئی دہلی میں سعودی سفارت خانہ میں کلچرل اتاشی ڈاکٹر محمد ابراہیم بطشان نے کہا کہ ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنی شاعری میں صحرا کا جو استعارہ استعمال کیا ہے، اسے اور زیادہ مثبت انداز میں استعمال کرنا چاہیے۔ ایس ایم خان نے کہا کہ شاعری کا ترجمہ بہت مشکل کام ہے لیکن حنیف ترین کی نظموں کا ترجمہ اس طرح سے کیا گیا ہے کہ ان کی اصل روح باقی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام یا کوئی اور مذہب دہشت گردی کی حمایت نہیں کرتا بلکہ اسلام امن اور ضبط کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے دہشت گردی کے خلاف ہم سب کو مل کر لڑائی لڑنی ہوگی۔

ڈاکٹر حنیف ترین نے اس موقع پر اپنی مشہور نظم 'سچے باقی رہ جاتے ہیں' سنائی۔ اس سے قبل فرحت احساس اور ڈاکٹر خالد محمود نے ڈاکٹر حنیف ترین کی شاعری پر تفصیلی اظہار خیال کیا۔ محمد ماجد نظامی نے اردو پریس کلب کی سرگرمیوں کو تفصیل سے پیش کیا جبکہ طارق فیضی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت سید اقبال احمد نے کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

شہادت سلطانی اور اسباب زوال سلطنتِ خداداد

● 24 جون۔ راج بھون بنگلور میں ریاستی گورنر جناب جسٹس راج بھردواج نے مرحوم صحافی جناب احمد اللہ خان کی کتاب ''شہادت سلطانی اور اسباب زوال سلطنت خداداد'' کا اجرا کیا۔ انھوں نے جناب احمد اللہ خان مرحوم کی دختر محمودہ خانم کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے والد کے مضامین کو یکجا کر کے جناب عزیز اللہ بیگ کی مدد سے اس کتاب کو مدوّن کیا اور منظرعام پر لائیں۔ جناب روشن بیگ نے کہا کہ اس سے قبل راج بھون میں مشاعروں کا اہتمام ہوتا تھا اور امید ظاہر کی کہ مسٹر بھردواج کے دور میں مشاعروں کے ساتھ ساتھ دیگر محفلیں بھی راج بھون میں منعقد ہوں گی۔ مہمان خصوصی مولانا ریاض الرحمٰن صاحب رشادی نے کہا کہ شیر میسور نے اپنی مملکت میں جہاں مسجد تعمیر کی، وہیں روبرو ہی مندر تعمیر کر کے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مثال چھوڑی ہے، اور ان کا یہ قول کہ'' گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک روزہ زندگی اچھی ہے،'' ہمارے لیے ایک سبق ہے، اس موقع پر سی ایم اے صدر الحاج مقبول احمد نے بھی خطاب کیا۔ جلسے کا آغاز شاہد احمد خان کی قرأت اور محمد عارف اللہ کی نعت سے ہوا، محمود خانم نے خیر مقدم کیا۔ اعظم شاہد نے نظامت کی اور منیر احمد جامی نے شکریہ ادا کیا۔ (سالار، بنگلور)

گھر آنگن سیلاب

● ادارۂ ارباب فکر وفن، ہوڑہ کے زیراہتمام ارشد نیاز کے افسانوں کے مجموعے ''گھر آنگن سیلاب'' کی رسم اجرا 12 جولائی 2009 کو دس بجے دن ادارہ امداد الغربا کے ہال میں ادا کی گئی۔ رسم اجرا ادا کرتے ہوئے معروف شاعر اور انجمن ترقی اردو شاخ بنگال کے صدر جناب قیصر شمیم نے کہا کہ ان افسانوں کے پڑھنے والوں کو بجا طور پر یہ احساس ہوگا کہ وہ پریم چند یا کرشن چندر کی روایت سے پرے ایک منفرد انداز سے روشناس ہو رہے ہیں۔ یہ کتاب اپنی کچھ خامیوں کے باوجود مروجہ افسانوی روایت سے انحراف کرتی ہے۔ نوشاد

مومن نے کہا کہ ارشد نیاز کے بعض افسانوں پر نثری نظم کا گمان ہوتا ہے۔ ابوذر ہاشمی نے افسانہ نگار کو جذبات کی تہذیب اور سنبھل کر قدم بڑھانے کا مشورہ دیا۔ کلیم حاذق نے افسانوں کی انفرادی نوعیت پر گفتگو کی۔

اس موقعے پر معروف افسانہ نگار مشتاق انجم نے ''گھر آنگن سیلاب'' پر ایک مضمون پڑھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ ڈپٹی ڈائرکٹر عبدالسمیع ناصر نے کہا کہ مصنف کے نام ارشد کے ساتھ نیاز کا لاحقہ ''نگار'' کے مدیر اور ایک خاص انداز کا افسانہ نگار نیاز فتح پوری کی یاد دلاتا ہے اور اسی نام کا اثر ہمارے سامنے اس کتاب کی شکل میں موجود ہے۔ جناب محمد نصیر الدین نے کتاب کی دس کاپیاں دس ہزار میں خرید کر ارشد نیاز کی ہمت افزائی کی۔ جناب عبدالمتین، جناب حیدر علی اور جناب اشرف علی اشرف نے مصنف کو مبارکباد دیتے ہوئے آگے بڑھتے رہنے کا مشورہ دیا۔

صدر محفل اور مشہور ڈراما نگار ظہیر انور نے اپنی تقریر میں مصنف کی کاوشوں کی تعریف کرتے ہوئے ''گھر آنگن سیلاب'' کو بنگال کے افسانوی ادب میں ایک ٹرننگ پوائنٹ قرار دیا اور ساتھ ہی مصنف کو عجلت پسندی سے گریز اور سنبھل کر قدم بڑھاتے رہنے کا مشورہ دیا۔ جناب ایم علی نے ادارے کی جانب سے تمام شرکائے محفل کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

گل بہ کف

● سہارنپور۔ 28 جولائی، انجمن زندہ دلان سہارنپور کے زیر اہتمام سہارنپور کے کہنہ مشق شاعر انور تاباں ایڈوکیٹ کے تازہ مجموعۂ کلام ''گل بکف'' کا اجرا انور کیفی مرادآبادی، اختر علی خاں سمیر، مولانا نشتر مظاہری، وہاج الحق کاشف، پروفیسر جلال عمر اور انجمن کے صدر آصف شمسی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت مولوی الیاس نشتر مظاہری نے فرمائی۔ اس موقع پر پروفیسر جلال عمر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس دور میں جب انتہا پسند شمشیر بکف ہو کر تشدد پر آمادہ ہیں ہمارے بزرگ شاعر انور تاباں نے گل بکف ہو کر انسان دوستی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور رواداری کا پیغام اپنے کلام کے ذریعے دیا ہے۔ مرحوم قمر مرادآبادی کے صاحبزادے وہاج الحق کاشف نے گل بکف کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انور تاباں کے چوتھے مجموعہ کلام میں بھی وہی تازگی ہے جو ان کے پہلے مجموعے کا حصہ تھی۔ مرادآباد سے آئے ہوئے انور کیفی نے مجموعے میں شامل نظموں، غزلوں پر مختصر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ انور تاباں کی شاعری میں ہمیں حسن ومحبت کا تذکرہ جگہ جگہ ملتا ہے۔ اختر علی خاں سمیر نے کہا کہ مجموعہ 3 حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصہ نعت ومنقبت دوسرا حصہ متفرق اشعار اور تیسرا حصہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے متفرق اشعار کو بکھرے ہوئے موتی قرار دیتے ہوئے صاحب کلام شاعر انور تاباں کو مبارکباد پیش کی۔

انجمن زندہ دلان سہارنپور کے صدر محمد آصف شمسی اور سکریٹری عاصم پیرزادہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ انجمن کے اراکین نے مہمانوں کی گل پوشی کی اور انھیں یادگار تحائف پیش کیے۔ نظامت کے فرائض راؤ محبوب علی اور سریش پسن نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ رسم اجرا کی تقریب کے بعد ایک پروقار شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت انور کیفی اور نظامت عاصم پیرزادہ نے کی۔ (صحافت، دہلی)

وفیات

یوسف ناظم

● اردو کے مشہور ومعروف مزاح نگار یوسف ناظم کا 23 جولائی کو صبح نو بجے بمبئی میں حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 91 سال کے تھے اور گذشتہ کچھ مہینے سے علیل تھے۔ ان کی تدفین باندرہ کے نوپاڑہ قبرستان میں ہوئی۔

یوسف ناظم 7 نومبر 1921 کو مہاراشٹر کے شہر جالنہ میں پیدا ہوئے تھے۔ دسویں جماعت تک وہیں تعلیم پائی۔ 1940 میں عثمانیہ کالج اورنگ آباد سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ 1942 میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے بی۔اے۔ اور 1944 میں اردو میں ایم۔اے۔ کیا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز اسکول میں دورانِ تعلیم ہی شعرگوئی سے ہوا۔ بعد میں وہ نثرنگاری کی طرف مائل ہوئے۔ ابتدائی نگارشات روزنامہ ''پیام'' اور ''میزان'' میں شائع ہوئیں۔ 1946 میں ان کی شادی حیدرآباد میں عائشہ بیگم سے ہوئی۔

یوسف ناظم کے مزاحیہ مضامین کے 20 مجموعے شائع ہوئے اور انھیں ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اگرچہ وہ آخر عمر تک شعر بھی کہتے رہے لیکن ان کی پہچان ان کی مزاحیہ نثر ہی بنی۔ مزاح ان کی طبیعت میں اس طرح رچ بس گیا تھا کہ ان کی گفتگو اور نجی خط وکتابت میں بھی اپنی بھرپور جھلک دکھاتا تھا۔ ان کی یہ زندہ دلی ہی ان کی تحریروں کا سرچشمہ تھی۔ یوسف ناظم مہاراشٹر اردو اکادمی کے جنرل سکریٹری اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے صدر بھی رہے تھے۔ ان کی وفات ایک بڑا ادبی حادثہ ہے۔

ایک اور افسوسناک حادثہ طنز ومزاح کے معروف شاعر بازغ کا انتقال ہے۔ ان کا انتقال 22 جولائی کو کولکاتا میں ہوا۔ وہ 57 برس کے تھے اور پچھلے چھ ماہ سے بیمار تھے۔ پس ماندگان میں اہلیہ، 3 بیٹیاں اور 2 بیٹے ہیں۔

ہم مرحومین کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

□□□

تبصرہ و تعارف

یک بابی اردو ڈرامے (انتخاب)

ترتیب و انتخاب: زبیر رضوی

صفحات: 494، قیمت: -/325 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی

مبصر: نوشاد عالم، 268 سابرمتی ہاسٹل، جے۔این۔یو، نئی دہلی-67

زیر تبصرہ کتاب ''یک بابی اردو ڈرامے'' زبیر رضوی کا انتخاب ہے۔ اردو یک بابی ڈراموں کا یہ انتخاب ڈرامے سے ان کی گہری دلچسپی اور شغف کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے پختہ شعور اور بالیدہ فکر کا بھی بین ثبوت ہے۔ 29 طبع زاد ڈراموں پر مشتمل اس انتخاب سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ اردو ڈراما خواہ فل لینتھ ہو یا پھر یک بابی، وقت اور حالات کے تقاضوں سے ہمیشہ ہم آہنگ رہا ہے۔ مزید برآں اردو ڈراما مسلسل نئے موضوعات اور نئے فنی لوازم و تکنیک کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

اردو یک بابی ڈراموں کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ قدیم تھیٹر کے بنیادی عناصر پر نظر ہو۔ قدیم تھیٹر کے بنیادی عناصر میں کہانی، رقص اور نغمے شامل ہیں۔ قدیم تھیٹر کے ڈراموں کی کامیابی کی ضمانت کا انحصار ان تین عناصر پر دکھائی دیتا ہے۔ کہانی، رقص اور گانا کے علاوہ قدیم تھیٹر کے مقاصد میں ایک کلیدی مقصد یہ بھی تھا کہ عوام الناس کو تفریح فراہم کر کے ان سے دولت کمائی جائے۔ اس قدیم تھیٹر کے بالکل متوازی ایک دوسری قسم کا ڈراما بھی اردو میں موجود تھا جسے ہم ''یک بابی اردو ڈراما'' کے نام سے جانتے ہیں۔ یک بابی اردو ڈرامے کی تخلیق کے پس پردہ ادبی محرک کارفرما تھا۔ فنکاروں کا ایک طبقہ وہ بھی تھا جسے لوگوں کو تفریح فراہم کرنے سے زیادہ اہم اپنے خیالات کا اظہار معلوم ہوتا تھا۔ جسے اس بات سے قطعی غرض نہ تھی کہ آیا جو ڈراما وہ تحریر کر رہے ہیں ان کو پیش بھی کیا جائے گا؟ یک بابی ڈراموں کی تکنیک اختیار کرنے والوں میں محمد حسین آزاد (اکبر) شرر (شہروفا) ظفر علی خاں (نازلی بیگم کا انصاف) اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی (زود پشیماں) کے اسما قابل ذکر ہیں۔

عام اردو ڈراموں کے مقابلے ان ڈراموں کی مدت پندرہ سے بیس منٹ کے درمیان کی ہوتی ہے۔ فل لینتھ ڈراموں کی طرح ان میں بھی پلاٹ، اس کا عروج، کردار اور دلچسپ خاتمہ ہوتا ہے۔ کہانی کے مختلف واقعات کی کڑیاں ایک مربوط اور منضبط اکائی میں ہوتی ہیں۔ دونوں ڈراموں کے درمیان بنیادی فرق یہ تھا کہ یک بابی ڈراموں کو طویل وقفے والے ڈرامے کی پیش کش کے دوران سرکس کے جوکر کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔

انتھالوجی میں شامل یک بابی اردو ڈراموں کا زمانہ سات دہائیوں کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ انتھالوجی کی ابتدا کرشن چندر کے ڈرامے ''کتاب کا کفن'' سے ہوتی ہے اور سعادت حسن منٹو کے یک بابی ڈرامے ''اس منجدھار میں'' پر اس ترتیب کا اختتام ہوتا ہے۔ اس طرح دیباچے میں جو بات کہی گئی ہے کہ اس ترتیب کا آخری ڈراما ''نئے ڈراما نگار قدیر زماں کے ڈرامے ''لنگڑا گھوڑا'' ہے، درست نہیں معلوم ہوتا۔ ایک دوسری غلطی یہ در آئی ہے جس کی طرف نشاندہی کرنا ضروری ہے کہ پیش لفظ میں اس ترتیب کو دو جلدوں پر مشتمل بتایا گیا ہے جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ کتاب کے سرورق پر جلد اول اور دوم تحریر نہ ہونے کے سبب کافی کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔

اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید اور ارتقا پر تو کتابیں بآسانی دستیاب ہیں لیکن ان کتابوں میں یک بابی ڈراموں کے ذکر کو خلط ملط کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ ایک ایسا انتخاب ہو جس میں اردو کے نمائندہ یک بابی ڈرامے ترتیب دیے جائیں جن سے اس کمی کی تلافی ہو سکے۔ زبیر رضوی صاحب کا یک بابی اردو ڈراموں کا یہ انتخاب وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

زبیر رضوی نے یک بابی اردو ڈراموں کی ترقی و رفتار کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ایک مختصر مگر جامع اور پرمغز دیباچہ بھی تحریر کیا ہے۔ انھوں نے دیباچے میں نئے تھیٹر کی شناخت کے حوالے سے بھی اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتایا ہے کہ یک بابی اردو ڈراموں کا وہ مخصوص کردار جو پہلے ہوا کرتا تھا اب رائج نہیں، مثلاً اب اسے طویل ڈراموں کے درمیان ایک انٹرلیوڈ (سرکس جوکر) کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا۔ آزادی کے بعد نیشنل اسکول آف ڈراما کے قیام اور ناٹک فیسٹول کے سالانہ اہتمام سے ڈرامے میں کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ڈراموں میں اس وقت مزید بڑے پیمانے پر تبدیلیاں آئیں جب 1956 میں نیشنل تھیٹر پر ایک سیمینار کا اہتمام ہوا۔ ان تبدیلیوں سے ہندوستانی تھیٹر میں نئے رجحانات اور رویوں کا آغاز ہوا ان سے اردو ڈرامے بھی متاثر ہوتے رہے۔ ڈراموں میں اس بات کی سعی کی جانے لگی کہ وہ عہد حاضر کے نئے مسائل اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔ ترتیب کا انتساب مناسب طور پر ''یک بابی اردو ڈراما لکھنے اور کھیلنے والوں کے نام ہے۔'' امید ہے کہ اردو داں طبقہ یک بابی اردو ڈراموں کے اس عمدہ انتخاب کو شرف قبولیت سے نوازے گا۔

صحتِ الفاظ

مصنف: سید بدر الحسن

صفحات: 251، قیمت: -/70 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: سعید النسا، J-3/14c، کرشنا کنج ایکسٹینشن، دہلی-92

زبان کوئی بھی ہو اس کی معیار بندی کے لیے صحت الفاظ ضروری ہے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے اپنے آغاز و ارتقا میں بہت سی زبانوں سے استفادہ کیا ہے اور اس عمل میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنی سان پر چڑھا کر اپنے امتزاجی مزاج میں ڈھالا ہے۔ اردو الفاظ کے صحیح تلفظ اور صحیح املا تیز تذکیر و تانیث کے سلسلے میں غلطیوں کے ارتکاب سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تھوڑی بہت ان سبھی زبانوں سے شناسائی ہو جن سے اردو نے استفادہ کیا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں جب گوناگوں مصروفیات نے لوگوں کو کم فرصتی کے آزار میں مبتلا کر دیا ہے۔ عمل مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے اس لیے اچھے خاصے اردو داں سمجھے جانے والے لوگ بھی اردو لکھنے میں املا کی غلطیاں ہی نہیں کرتے بلکہ بولنے میں بھی الفاظ کا غلط تلفظ کر جاتے ہیں۔ تحریر میں املا اور اعراب کی غلطیاں اب تو عام ہوتی جا رہی ہیں۔ اردو کے اخبارات اور رسائل میں اس طرح کی غلطیاں ہر صفحے پر نظر آ جاتی ہیں۔

ان حالات میں بدر الحسن صاحب نے یہ کتاب ترتیب دے کر اردو کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے کتاب کے مواد کو 33 عنوانات کے تحت پیش کیا ہے۔ یہ عنوانات تلفظ، املا، اعراب، عروض و قواعد، تذکیر و تانیث، غلط العام اور غلط العوام جیسے مسائل پر مبنی ہیں جن کی اہمیت مسلم ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو لکھے تو جاتے ہیں درست لیکن بولے جاتے ہیں غلط۔ بعض الفاظ غلط بولے بھی جاتے ہیں اور غلط لکھے بھی جاتے ہیں۔ مولف نے دونوں طرح کے الفاظ کی الگ الگ نشاندہی کی ہے۔

الفاظ کے معنی درج کرنے میں مولف نے وضاحت اور کفایت لفظی دونوں سے کام لیا ہے۔ کتاب میں تقریباً ان تمام الفاظ کا احاطہ کیا گیا ہے جو تحریر و تقریر میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

بدر الحسن صاحب نے یہ کتاب ترتیب دے کر ایک اہم خدمات انجام دی ہے اس کتاب کی اہمیت متقاضی ہے کہ یہ ہر اردو داں شخص کے پاس موجود رہے۔ اسے اردو زبان کے ہر استاد کے مطالعے میں بھی رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے طلبہ کو اردو الفاظ کا صحیح تلفظ اور درست معنی از بر تر اس کے اور اس ضمن میں خود اس کا علم بھی تازہ ہوتا رہے۔ اخباروں اور رسالوں کے دفتروں میں بھی اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے تاکہ ان کے صفحات پر جن غلطیوں کا بار بار اعادہ ہوتا رہتا ہے، ان کا کچھ تدارک ہو سکے۔

دکنی لغت

مصنف: سیدہ جعفر

صفحات: 521، قیمت: -/590 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: عبدالرشید اعظمی، 121 گوداوری ہاسٹل، جے. این. یو، نئی دہلی-67

قدیم دکنی متن کی قرأت اگر متن کے حسب منشا ہو جاتی ہے تو قاری کے لیے معانی و مطالب کی تفہیم کسی حد تک آسان ہو جاتی ہے۔ قدیم دکنی زبان و ادب کی قرأت عام لوگوں کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کی وجوہات بھی ہیں۔ قدیم زبان و ادب کے مطالعے کے لیے ایک مخصوص تہذیبی فضا سے واقفیت ہی ضروری نہیں بلکہ کئی زبانوں سے آشنائی بھی ضروری ہے۔ قدیم دکنی ادب کے ذخیرۂ الفاظ پر غور کیا جائے تو ایسے الفاظ کثیر تعداد میں ملتے ہیں جو دیگر مختلف زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت، مراٹھی، گجراتی، تلگو، برج بھاشا اور پنجابی کے علاوہ قدیم دکنی ادب میں ایسے بے شمار الفاظ بھی ہیں جن کا شمالی ہند خصوصاً مشرقی یو. پی کے دیہات و قریات میں عام چلن ہے۔ اس طرح قدیم دکنی زبان و ادب کے مطالعے سے متعدد ثقافتوں اور زبانوں کے باہم اختلاط و انسلاک کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً: اچھتے (ہوتے ہوئے) سوں (قسم) بیانا (جنم دینا، پیدا کرنا)، ہلک (ڈانٹنا، للکارنا)، اٹک (رکنا، ٹھہرنا)، کیچ (کیچڑ)، بھئیں (زمین)، بھئے (ہوئے)، ات (بہت)، بھینت (دیوار)، مھینا (طعنہ)، بہرچی (باورچی) وغیرہ الفاظ ایسے ہیں جو مشرقی یو. پی کی عام بول چال میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اور قدیم دکنی نظم و نثر میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے دکنی ادیبوں اور شاعروں کی ہمہ جہت شخصیت اور ذو لسانیت کا علم ہوتا ہے۔ دکنی زبان و ادب کے مطالعے اور اس سے استفادے کے لیے لغت کا سہارا لینا ناگزیر ہے۔ قدیم دکنی ادب اردو ادبیات کی اساس ہے، اس لیے اس سرمائے سے واقفیت لازمی و ضروری ہے۔ ہر جدید ادب اپنے ماضی سے غذا حاصل کرتا ہے اور پھر خود ماضی بن کر آنے والے زمانے کے ادب کو غذا فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے ماضی کے ادبی اثاثے سے بخوبی واقف ہوں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ایک پروجیکٹ دکنی زبان و ادب کی تفہیم کے لیے تیار کیا۔ اس پروجیکٹ کی تکمیل کی ذمے داری محترمہ سیدہ جعفر کو سونپی گئی جنھوں نے اپنے معاونین کی مدد سے اس اہم کام کو بحسن خوبی تکمیل تک

پہنچایا۔ سیدہ جعفر نے بڑی عرق ریزی و دل سوزی سے کام کیا ہے۔ ان کا یہ ''دکنی لغت'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی سلسلہ وار نصابی و غیر نصابی اشاعت کی ایک اہم کڑی ہے۔ اگرچہ ''دکنی لغت'' سے قبل کئی لغات دکنی ادبیات کی تفہیم کے لیے شائع ہوئی ہیں لیکن سیدہ جعفر صاحبہ کا کارنامہ اپنے تئیں منفرد ہے۔ اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ساڑھے پانچ سو سال پرانے الفاظ تک کو جگہ دی گئی ہے اور ان پر اعراب بھی لگائے گئے ہیں تاکہ تلفظ واضح ہو سکے۔ الفاظ کے معنی کے ساتھ ان کے استعمال کی چار چار مثالیں بھی دی گئی ہیں اور ماخذ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ بعض الفاظ متعدد معنوں اور مختلف صورتوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ مثالوں کے ضمن میں زیادہ تر مثالیں نظموں سے دی گئی ہیں اور شاعر کا نام بھی درج کیا گیا ہے اور ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ پورے اشعار نہ دے کر صرف وہی مصرعے دیے گئے ہیں جن میں وہ لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ البتہ ایسے مواقعے پر جہاں لفظ کا مفہوم ایک مصرعے سے واضح نہیں ہوتا دونوں مصرعے دیے گئے ہیں۔ سیدہ جعفر صاحبہ تقریباً چالیس سال سے دکنی ادب پر کام کر رہی ہیں اور قدیم دکنی زبان و ادب پر کامل عبور رکھتی ہیں۔ قدیم دکنی ادب پر مہارت کا مطلب، بیک وقت سنسکرت، مراٹھی، گجراتی، برج بھاشا، پنجابی اور عربی و فارسی سے آگاہی ہے اور شمالی ہندوستان کی بولیوں سے بھی۔ سیدہ جعفر صاحبہ میں یہ صفات موجود ہیں جس کا ایک ثبوت یہ کتاب بھی ہے۔

یہ لغت 521 صفحات پر مشتمل ہے۔ اندراجات 13100 سے زائد ہیں۔ طباعت دیدہ زیب ہے۔

فکشن شعریات: تشکیل و تنقید

مصنف: گوپی چند نارنگ

صفحات: 472، قیمت: -/375 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: مشتاق صدف، 381/22، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

اسلوبیات، فکریات، تھیوری یا مابعد جدیدیت کے مباحث سے پروفیسر نارنگ کی وابستگی جگ ظاہر ہے تو اردو کی فکشن تنقید سے ان کا سروکار بھی گذشتہ کئی دہائیوں سے گہرا رہا ہے۔ علم بیانیات (Narratology) جو فکشن تنقید کا کلیدی جزو ہے، اس کے نظری اور عملی مباحث پر انھوں نے معرکۃ الآرا مضامین لکھے ہیں۔

''فکشن شعریات: تشکیل و تنقید'' گوپی چند نارنگ کے فکشن سے متعلق ان مضامین کا گلدستہ ہے جو گذشتہ چار دہائیوں میں لکھے گئے اور جن کی خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ یہ مضامین برصغیر کے معیاری رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔ اب نارنگ صاحب نے اپنے کچھ احباب کے اصرار پر ان مضامین کو ایک مبسوط کتاب کی شکل دے دی ہے جس سے فکشن سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایک جگہ تمام مضامین مطالعے کے لیے مل جائیں گے اور انھیں فکشن شعریات سے متعلق اپنی کوئی رائے قائم کرنے میں آسانی بھی ہوگی۔

پروفیسر شافع قدوائی نے کتاب پر ایک جامع مقدمہ تحریر کیا ہے اور جس میں گوپی چند نارنگ کے مضامین کو Trail Blazing قرار دیتے ہوئے کئی اہم نکات خصوصاً بیانیات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ان کی تحریروں کی قدر و قیمت سے ہمیں روشناس کرایا ہے۔

کتاب میں کل 19 مضامین شامل ہیں جن میں پروفیسر نارنگ نے پریم چند، منٹو، بیدی، بلونت سنگھ، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، بلراج مینرا، سریندر پرکاش، کرشن چندر، گلزار، جابر حسین، سلام بن رزّاق، منشا یاد، ساجد رشید، انجم عثمانی وغیرہ کے افسانوی متن پر اپنی دانشورانہ تحریر سے فکشن تنقید کی نئی گزرگاہوں کو روشن کیا ہے۔ انھوں نے فکشن شعریات کے امتیازات اور فکشن تنقید کے امکانات کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ واضح کیا ہے یہ انھی کا حصہ ہے۔ نارنگ صاحب نے جہاں افسانے کے Storyline، متن کی نوتشکیل اور اس کی معنویت پر سوالات قائم کیے ہیں وہیں زبان کے خودمگر کردار، بیانیہ کی تشکیل، تانیثی افسانے کے امتیازات اور افسانے کے ثقافتی خلقیہ پر بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے کہانی میں مصنف کی آواز کے ساتھ دوسری آوازوں کے تفاعل پر بھی خیال انگیز مضامین لکھے ہیں، کہانی کے ردتشکیلی مطالعے کو بھی موضوع بحث بنایا ہے اور ان تمام مباحث میں انھوں نے ادق اصطلاحوں یا نظری مسائل سے گریز کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تھیوری اور تنقید دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

نارنگ صاحب نے اپنے مضامین میں بڑی معروضیت کے ساتھ فن کاروں کے فنی عیوب کو بھی نشان زد کیا ہے اور ان کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں۔ مضمون ''افسانہ نگار پریم چند'' میں انھوں نے ''کفن''، ''عیدگاہ''، ''سوا سیر گیہوں''، ''دو بیلوں کی کہانی''، ''جرمانہ''، ''دودھ کی قیمت''، ''شطرنج کے کھلاڑی''، ''پوس کی رات'' جیسی پریم چند کی بڑی کہانیوں کی تکنیک میں Irony کے استعمال کا محاکمہ کیا ہے جب کہ ''منٹو کی نئی پڑھت'' میں منٹو کے فن کو ایک عورت کی گھائل روح کے درد کو ظاہر کرنے والا فن قرار دیا ہے۔ ''بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں'' اور ''ایک باپ بکاؤ ہے'' ان کی معروضی تجزیاتی فکر کا نتیجہ ہے۔ مضمون ''چند لمحے بیدی کی ایک کہانی کے ساتھ'' میں ''ایک باپ بکاؤ ہے'' کا جو تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اس سے افسانہ نگار کا موضوعاتی اور فنی سروکار واضح ہوتا ہے۔ وارث علوی نے ان مضامین کو Marvellous قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے خود نارنگ صاحب سے

افسانوی تنقید کے بہت سے ہنر سکھے ہیں۔

''انتظار حسین کا فن: متحرک ذہن کا سیال سفر'' میں نارنگ صاحب نے سیاسی بیانیات کی اصطلاح استعمال کیے بغیر ان کے Political Discourse کو دلائل سے پیش کیا ہے۔ ''اردو میں علامتی اور تجریدی افسانہ'' میں انھوں نے بلراج مینرا اور سریندر پرکاش کی کہانیوں میں علامتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی معنوی تہہ داری کو روشن کیا ہے۔ ''بلونت سنگھ کا فن: سائیکی، ثقافت اور شکستِ رومان'' میں پروفیسر نارنگ نے شکستِ رومان اور اقدار کے زوال کی معنویت کو پہلی بار ابھارا ہے۔ ''جابر حسین کی آلوم لاجاوا اور نال کی مرنی'' والے مضمون سے مابعد جدید فکشن تنقید کی اطلاقی جہتیں روشن ہوتی ہیں۔ ''ساجد رشید: مہانگری زیرناف اور سماجی ڈسکورس'' میں انھوں نے ساجد رشید کی کہانیوں میں تہذیبی، سماجی اور سیاسی مسائل کا ڈسکورس قائم کرتے ہوئے ان کی موضوعاتی بوقلمونی کو سراہا ہے۔ ساتھ ہی مہانگر کے زیرناف (Underbelly) اور دوسرے پہلوؤں سے متعلق ان کے بیانیہ کو پرکشش قرار دیا ہے۔ جبکہ ''مدرسے اور مولسری سے لگی کہانی'' میں تہذیبی بحران سے پیدا ہونے والے مسائل کو انجم عثمانی نے فن کی بنیادی اساس قرار دیا ہے۔ اسی طرح ''گلزار کی کہانیوں میں زندگی کی کتاب'' میں انھوں نے نظریاتی وابستگی اور فنی درجہ بندی سے حددرجہ اجتناب پر گفتگو کی ہے اور گلزار کے افسانوں کے اسرار ورموز سے پردہ اٹھایا ہے۔

''فکشن کی شعریات اور ساختیات'' میں نارنگ صاحب نے ساختیاتی مطالعے کے بنیادگزاروں کی خدمات کا ذکر کیا ہے اور لوک کہانیوں کی اصل یعنی متھ، فکشن کے صنفی نظام، بیانیہ کے معنیاتی نظام اور ڈسکورس کی تفریق پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ''نیا افسانہ: روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحۂ فکریہ'' میں انھوں نے کہانی پن پر زور دیا ہے جب کہ ''نیا افسانہ: علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر'' میں نئی کہانی کے رشتے کو کتھا کہانی کی پرانی روایت سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ کتاب میں دو مضامین (''جدید نظم کی شعریات اور کہانی کا تفاعل'' اور ''مثنوی گلزارنسیم کی معنویت'') ایسے ہیں جو شاعری سے متعلق ہیں تاہم ان میں بھی وہ فکشن موضوعِ بحث آیا ہے جس کا اظہار شعری بیانیوں کے سانچے میں ڈھل کر ہوا ہے۔ ''جدید نظم کی شعریات اور کہانی کا تفاعل'' میں انھوں نے بیانیہ کی ساخت اور اس کے عمل پر معروف شعرا کی نظموں کے حوالے سے دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ ''مثنوی گلزارنسیم'' میں نارنگ صاحب نے آرکی ٹائپل تنقید سے گہری دلچسپی کا ثبوت دیا ہے اور مثنوی کی زیریں ساخت کے تفاعل پر عمیق نظر ڈالی ہے۔ ''کرشن چندر اور ان کے افسانے'' میں افسانہ نگار کے مختلف اسالیب پر گفتگو کی ہے اور فن پر ان کی کمزور گرفت کو بھی بیان کیا ہے۔ ''پرانوں کی اہمیت'' میں انھوں نے پرانوں کے کرداروں اور کہانیوں کے حوالے سے ان کے متن کے مطالعے پر اصرار کیا ہے نیز پرانوں کے عام ڈھانچے کو مکالمہ قرار دیا ہے۔ اس کتاب میں قرۃ العین حیدر پر انگریزی میں ایک مضمون "Qurratul Ain Hyder An Author Par Excellence" بھی شامل ہے جس میں ان کے فن پر بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ پروفیسر نارنگ نے گیان پیٹھ ایوارڈ کے لیے بحیثیت کنوینر یہ مضمون لکھ کر قرۃ العین حیدر کو ایوارڈ دینے کی سفارش کی تھی۔

زرنقد (مضامین کا مجموعہ)

مصنف: محمد شاہد پٹھان

صفحات: 304، قیمت: -/140 روپے

ناشر: راجستھان بلاک، نہرو بازار، جے پور

مبصر: ڈاکٹر نشاں زیدی، پی-77، سیکٹر-11، نوئیڈا، یوپی

محمد شاہد پٹھان شاعر، نقاد اور محقق کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ ''زرنقد'' ان کے 16 مضامین کا مجموعہ ہے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ کتاب میں شامل تقریبا تمام مضامین مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوکر قبول عام پا چکے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے محمد شاہد پٹھان کے تنقیدی شعور اور عمیق مطالعے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ پہلا مضمون ''مولانا حالی کے تنقیدی نظریات'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں مصنف نے حالی کو اردو کا اولین نظریہ ساز نقاد قرار دیتے ہوئے حالی کی تنقید نگاری پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور مقدمۂ شعروشاعری کو بوطیقا کا درجہ دینے کی حمایت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''حالی سے قبل اگرچہ محمد حسین آزاد جدید نظریۂ شعر اور نئے تنقیدی مباحث کا آغاز کر چکے تھے، لیکن اردو تنقید کا منشور اول ''مقدمۂ شعروشاعری'' ہی قرار پاتی ہے۔''

رشید احمد صدیقی کا شمار اردو کے صف اول کے طنزومزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے خاکے اور انشائیے ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں لیکن وہ تنقید نگار بھی تھے۔ ''رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری'' اس کتاب کا دوسرا مضمون ہے۔ اس میں مصنف نے رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری کا دور رومانوی تحریک سے جدیدیت تک پھیلا ہوا ہے۔ مصنف نے ان کی مختلف تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے اقتباسات بھی اخذ کیے ہیں۔ تیسرا مضمون ''امداد امام اثر کا اسلوب نقد'' ہے، جس میں ''کاشف الحقائق'' کو سامنے رکھتے ہوئے امداد امام اثر کے تنقیدی طریق کار سے روشناس کرایا گیا ہے۔

مخمور سعیدی کا شمار موجودہ دور کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے اب تک دس شعری مجموعے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ چوتھا مضمون ''مخمور

سعیدی: دیوار و در کے درمیاں'' اپنی نوعیت کا ایک اہم مضمون ہے۔ جس میں مصنف نے جہاں مخمور سعیدی کے شعری رجحانات پر گفتگو کی ہے وہیں مخمور سعیدی کے ''جدیدیت'' اور ''ترقی پسند تحریک'' کے تئیں نظریات کو بھی پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی تخلیقی عمل سے متعلق مخمور سعیدی کے خیالات و نظریات سے روشناس کرانے کے لیے اقتباسات کو مثالاً پیش کیا ہے۔ وہ جہاں مخمور صاحب کی شاعری کے دیگر پہلوؤں سے محظوظ ہوتے ہیں وہیں ان کی عشقیہ شاعری سے کافی متاثر نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''اگر مجھے ایک جملے میں مخمور سعیدی کی عشقیہ شاعری پر اظہار خیال کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ مخمور سعیدی ہجر و وصال دونوں دنیاؤں کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں فراقِ یار کی وادیِ ظلمت بھی ہے اور وصال کے کیف و سرور کی کہکشاں بھی آباد ہے۔''

پانچواں مضمون ''ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا تنقیدی رویہ'' ہے جس میں وہ عبدالرحمٰن بجنوری کو پہلا غالب شناس قرار دیتے ہوئے ادبیات سے آگہی کی فہرست میں سب سے اوپر بجنوری کا نام رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو میں یوں تو اولاً امداد امام اثر اور بعد ازاں مولانا شبلی نے عملی وتقابلی تنقید شروع کردی تھی لیکن بین الاقوامی سطح پر علوم و ادبیات کے مطالعے و موازنے کی کوشش سب سے پہلے بجنوری نے کی۔''

چھٹے مضمون میں وادیِ کشمیر کے کہنہ مشق شاعر اکبر جے پوری کی شخصیت اور شاعری کا محاسبہ کیا گیا ہے۔ ''مولوی عبدالحق بحیثیت ناقد'' بھی ایک قابل قدر مضمون ہے۔ جس میں مولوی عبدالحق کی مقدمہ نگاری اور تبصرہ نگاری کے فن کو تحقیق و تنقید کا ترجمان گردانتے ہوئے عبدالحق کی تنقیدی و تحقیقی خدمات خصوصاً ''دکنی ادب پاروں کی تحقیق''، تدوین اور تنقید کے تعلق سے جو خدمات انجام دی ہیں مصنف نے ان کا بڑے سلیقے سے احاطہ کیا ہے اور عبدالحق کی تنقید نگاری سے متعلق دیگر ناقدین کی آرا بھی شامل کی ہیں۔ ''شباب للت کے شعری امتیازات''، ''تنقیدی اصول اور نظریے: ایک مطالعہ''، علامہ شبلی کا آہنگ غزل''، ''تفہیم داغ کی ایک تازہ کوشش''، ''مثنوی جہیز کی لعنت کا تنقیدی جائزہ''، ''عقیل شاداب بے آب سمندر میں''، ''تحفۂ راجستھان پر ایک طائرانہ نظر''، ''مظفر صدیقی کی غزلیہ شاعری'' اور ''تلمیذ سیمات: لکشمی نارائن فارغ'' اس کتاب کے دیگر مضامین ہیں۔

کتاب پڑھ کر جہاں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت اور ان کے فن سے آگاہی ہوتی ہے وہیں یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے تنقیدی بصیرت سے تو کام لیا ہے لیکن تنقیص اور منفی انداز سے احتراز کیا ہے۔ کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ اقتباسات کا استعمال گراں گزرتا ہے۔

ننگی آوازوں کی گونج

مصنف: عبید قمر

صفحات: 112، قیمت: -/100 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: فخرالدین عارفی، اردو گھر، اشوک راج پتھ، پٹنہ-4

عبید قمر ایک ذہین اور باشعور افسانہ نگار ہیں۔ ان کا تعلق ساتویں دہائی میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں سے ہے۔ ساتویں آٹھویں دہائی کے درمیان جتنے افسانہ نگار منظر عام پر آئے ان کی تعداد چونکا دینے والی تھی۔ بیرون بہار سے جہاں سلام بن رزاق، انور خاں، قمر احسن، انور قمر، ساجد رشید، حمید سہروردی، نورالحسنین، طارق چھتاری، غضنفر، نیر مسعود، سید محمد اشرف، مظہرالزماں خاں، علی امام نقوی اور اسرار گاندھی وغیرہ سامنے آئے وہیں بہار سے عبدالصمد، رضوان احمد، شفق، شمیم صادقہ، مشتاق احمد نوری، انیس رفیع، علی امام، م.ق. خان، شموئل احمد اور عبید قمر وغیرہ نے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ ان افسانہ نگاروں نے دم توڑتی ترقی پسند تحریک اور روایتی رومان پسندی سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے اپنے لیے ایک نئی راہ پیدا کی۔ ظاہر ہے یہ فہرست مکمل نہیں اس میں مزید ناموں کا اضافہ ہوسکتا ہے۔

عبید قمر نے کبھی فیشن کے طور پر افسانے نہیں لکھے۔ بہ الفاظ دیگر وہ سستی شہرت پسندی سے دور رہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے ایسے مسائل کو آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے جو ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ عبید قمر کے افسانے اپنے دور اور سماج کی بھرپور مرقع نگاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

''ننگی آوازوں کی گونج'' میں ان کے پندرہ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں فن کا ارتقائی سفر بتدریج صاف نظر آتا ہے۔ آج کا ''انسان'' سماج میں کئی چہروں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، اس کے باطن و ظاہر میں نمایاں فرق ہے۔ یہ فرق انسانیت کے چہرے کو مسخ کرتا ہے۔ لیکن ہم اتنے بے حس یا عیار ہو چکے ہیں کہ اس کی پروا کیے بغیر اپنا آگے کا سفر طے کرتے رہتے ہیں اور پامال ہوتی ہوئی قدروں کی اپنے دل میں کوئی کسک محسوس نہیں کرتے۔ عبید قمر کا افسانہ ''انسان'' اس موضوع پر ایک کامیاب افسانہ ہے۔ ''دہشت زدہ'' افسانہ ایک ایسا افسانہ ہے جو موجودہ سماج کے انتشار کو پیش کرتا ہے۔ بے چینی، اضطراب، عدم تحفظ کا احساس اور ان سب کے ساتھ ایک بے نام سی بے یقینی آج ہر ذہین اور باشعور کا مقدر بن چکی ہے۔ روایت سے انحراف اور آج کی مشینی اور کاروباری زندگی کی جانب یہ افسانہ خوبصورتی کے ساتھ اشارہ کرتا ہے۔

''نامراد گوتم'' بھی کئی اعتبار سے ایک اہم افسانہ ہے۔ حالات کی کشمکش

اور دنیاوی آلام و مصائب آج کے انسان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکے ہیں اور کوئی بھی جگہ جائے امان نہیں ہے، فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں اور آج کا آدمی گوتم بن کر زندگی کا بن باس کاٹتا ہے۔ ''کترن'' علامتی حقیقت نگاری کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ اس میں عبید قمر کی کرافٹ مین شپ کا کمال نظر آتا ہے، جس کی بابت ڈاکٹر قمر رئیس رقم طراز ہیں:

''کترن، کہانی علامتی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ سچ مچ افسانے کے کرافٹ سے آپ کی واقفیت معتبر اور گہری ہے۔ اس سے اہم بات یہ کہ آپ کی سماجی فکر میں تہہ داری اور تیکھا پن ہے جس کے بغیر اعلیٰ ادب کی تخلیق ممکن ہی نہیں۔ کترن جو ایک فضول، بیکار، بے مقصد شے ہے اسے آپ نے انقلابی جہت دے دی ہے۔ ایسی خوبصورت کہانی آپ نے لکھی ہے جس پر آپ کو فخر ہونا چاہیے۔''

عبید قمر کے دوسرے افسانوی مجموعے ''ننگی آوازوں کی گونج'' کے مطالعے سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اچھی افسانہ نگاری کی سمت میں یہ مجموعہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور عبید قمر کی پختگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

افسانہ نگار اور افسانے

مصنف: ڈاکٹر سید احمد قادری

صفحات: 140، قیمت: -/200 روپے

ناشر: مکتبہ غوثیہ، نیو کریم گنج، گیا (بہار)

یہ کتاب پریم چند سے مشرف عالم ذوقی تک پندرہ افسانہ نگاروں کے افسانوں کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ اس طرح یہ تجزیہ کئی نسلوں کا احاطہ کرتا ہے۔ مصنف نے افسانہ نگاروں کی سوانحی تفصیلات بھی فراہم کی ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں مصنف نے لکھا ہے کہ '' میں نے پریم چند سے لے کر عہد حاضر کے چند نمائندہ افسانہ نگاروں کے افسانوں کا متنازعہ مباحث سے بچتے ہوئے تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اس عمل میں میں کس حد تک کامیاب ہوسکا ہوں اس کا فیصلہ ہمارے قارئین کو کرنا ہے۔''

کتاب کا مطالعہ مصنف کے اس بیان کی تائید کرتا ہے۔

روزن سے کہکشاں

شاعر: خمار قریشی

صفحات: 158، قیمت: -/150 روپے

ناشر: افلاک پبلی کیشنز، گلبرگہ

''روزن سے کہکشاں'' خمار قریشی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو پہلے مجموعے ''پیوندِ خستہ بادباں'' (1988) کے 18 برس اور خمار قریشی کے انتقال کے تین سال بعد ان کے احباب (اکرم نقاش اور انیس صدیقی) کی کاوشوں اور کرناٹک اردو اکادمی کے مالی تعاون سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں جناب وہاب عندلیب، جناب حامد اکمل اور جناب اکرم نقاش نے خمار قریشی کے فکر وفن اور شخصیت کا احاطہ کرکے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

خمار قریشی نظم وغزل سے یکساں دلچسپی رکھتے تھے اور جدیدیت کے رجحان سے متاثر تھے۔ انھوں نے آزاد غزل بھی کہی ہے جو ان کی تجربہ پسند طبیعت کی غماز ہے۔ کتاب کا گیٹ اپ خوش نما ہے اور قیمت مناسب۔

حسنِ التماس

شاعر: حیرت فرخ آبادی

صفحات: 176، قیمت: -/200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6

حیرت فرخ آبادی کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ ان کے والد متھرا پرساد مشر کئی زبانوں کے ماہر تھے مگر شعر اردو میں کہتے تھے۔ ان کا تخلص نامی تھا۔ حیرت فرخ آبادی 1952 سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''نوائے سازِ دل'' 1987 میں چھپا تھا۔

حیرت صاحب مزاجاً روایت پسند ہیں۔ حیرت صاحب غزل کے ساتھ نظموں میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن ذہنی مناسبت غزل سے زیادہ ہے۔ ان کا کہنا ہے:

'' جب بھی کوئی ہندو، مسلمان یا عیسائی مارا جاتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرا ہی خون بہہ رہا ہے۔'' اور وہاب اشرفی کے الفاظ میں: '' جناب حیرت کوشش کرتے ہیں کہ عصری میلانات کی پیش کش میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔'' وہاب اشرفی کے علاوہ کتاب میں قمر رئیس اور علی احمد فاطمی کی رائیں بھی شامل ہیں۔

اردو زبان کے فروغ میں ریڈیو، ٹیلی ویژن کا حصہ

مصنف: ڈاکٹر حسام الدین فاروقی

صفحات: 172، قیمت: -/200 روپے

ناشر: دبستانِ بھوپال

ڈاکٹر حسام الدین فاروقی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی کے مواصلاتی سینٹر میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر کی حیثیت سے کیا تھا۔ فاصلاتی نظام تعلیم نیز نشریات سے متعلق عملی خدمات کے سبب انھیں اس شعبے میں یکجا کردیا ہے۔ انھوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ساتھ دیگر جدید تکنیکی ذرائع وسائل کی ابتدا، ترقی، نوعیت، اقسام اور ان تمام امور پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے جو اردو زبان کے فروغ میں ممد ومعاون ثابت ہورہے ہیں۔ □□□

فراغ روہوی

دو نظمیں

سورج

سورج نکل رہا ہے
منظر بدل رہا ہے
ساگر میں کل سما کے
نکلا ہے پھر نہا کے
چھٹنے لگا اندھیرا
اُگنے لگا سویرا
کیا صبح کسمسائی
پھر کھل اُٹھی خدائی
سورج جہاں میں تنہا
پھیلاتا ہے اُجالا
دُنیا کو روشنی دی
پودوں کو زندگی دی
کہتا رہا زمانہ
صدیوں سے یہ فسانہ
پیشانی فلک کا
سورج چمکتا ٹیکہ
مشرق سے چل پڑا ہے
مغرب کو جا رہا ہے
رو کے کہاں رُکے گا
چلتا ہی وہ رہے گا
جب شام کی پہاڑی
اُلٹے گی دن کی گاڑی
سورج بھی جا چھپے گا
پردے میں پھر رہے گا
بدلیں گے پھر نظارے
چمکیں گے چاند تارے

کمپیوٹر

کمپیوٹر کا ہے یہ دور — اب جینے کا بدلا طور
دفتر دفتر، گھر گھر آج — دیکھ لو کمپیوٹر کا راج
قدم قدم پر صبح و شام — کمپیوٹر ہی آئے کام
اس سے ہم کیوں ہوں محروم — جب کمپیوٹر کی ہے دھوم
دور ہمارا ہے کچھ اور — کمپیوٹر سیکھو فی الفور
چیز بنی حیرت انگیز — اس کی میموری ہے تیز
حرف سبھی اور سب اعداد — کمپیوٹر رکھتا ہے یاد
علم و فن سے ہے آباد — اچھا خاصا ہے استاد
ہر بھاشا کر لو تحریر — اور بنا لو ہر تصویر
اس پر کرلو ہیڈ اور ٹیل — پھر کھیلو من چاہے کھیل
نئی چلائی اس نے ریت — اس پر بھی بجتے ہیں گیت

سیکھ کے کمپیوٹر بچو
اپنے خواب کو سچ کر لو

•

پتہ:
67, Maulana Shaukat Ali Street,
(Colootola Street), Kolkata-700073

نذیر احمد یوسفی

چھوٹی سی بھول

دور تک اینٹ کی دیواروں سے گھرا احاطہ تھا، جس کے آخری سرے پر ایک مضبوط اور بڑا سا لوہے کا گیٹ تھا، اندر جگہ جگہ رسیلے پھلوں کے بڑے بڑے درخت تھے، جن میں کئی ایک تو پھلوں سے لدے پھندے تھے۔ ایک طرف ایک اصطبل تھا، جس میں ایک نہایت تندرست، خوش رنگ گھوڑا بندھا تھا۔ تھوڑی سی ہی دوری پر بھینس کے لیے پھوس کی چھپر والی کھٹال بھی تھی جس میں ایک بھاری جسم والی بھینس بندھی تھی۔ ہلکی سردی کا موسم تھا، سویرے سویرے جانوروں کے کھانے کی چیزیں ان کے سامنے ڈال دی گئی تھیں۔ وہ سب روزانہ کی ضیافت میں مصروف تھے۔

بوڑھی بکری ابھی ابھی اپنے کھونٹے سے کھل کر، دھوپ کھا کر تازہ دم ہوئی تھی، چھوٹی لیکن تگڑی بکری کے ناز نخرے، مالک زیادہ اٹھاتا تھا کیونکہ یہ بکری ان کے بچوں کی لاڈلی تھی۔

بکری ہلتی ڈولتی پہلے اصطبل کی طرف گئی، گھوڑے نے توجہ نہیں دی تو جل کر بھینس کی طرف آئی لیکن اس نے بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تو اسے تاؤ آ گیا، ممیاتے ہوئے دوبارہ گھوڑے کے قریب آئی اور غصے سے تنک کر بولی: ''کیوں؟ سب کے سب خاموش ہو، مجھ سے کوئی ناراضگی ہے کیا۔؟''

اس مرتبہ گھوڑے نے ہنہناتے ہوئے جواب میں کہا: ''ارے پوچھو مت، رات پھر تکرار ہوگئی اس کالی کلوٹی سے۔'' بکری نے گھوڑے کی طرف دیکھا تو اس کا لمبا سا سر، کالی بھینس کی طرف اٹھا۔

''تکرار، وہ کس لیے؟ مالک نے اسی لیے تو سب کے کھانے، رہنے کے لیے، الگ الگ انتظام کر رکھے ہیں کہ کوئی کسی کے گھر میں نہ داخل ہو اور سب چارہ کھائیں۔ پھر یہ تکرار کیسی؟''

''وہی پرانی بات، خاندانی رنجش والی، اس نے رات ایک سرد آہ کے ساتھ، مجھے پھر کوسنا شروع کر دیا تھا۔'' گھوڑے نے موٹی بھینس کی طرف چور نظروں سے دیکھتے ہوئے، بات نہایت ہلکی آواز میں بکری کے گوش گزار کی۔ گھوڑے کی آواز میں دکھ بھرا تھا۔ کالی بھینس گردن اٹھا کر، غصہ بھری نظروں سے اصطبل کی طرف ہی دیکھے جا رہی تھی۔ بکری کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ گھوڑے نے کون سی بات، بیتے دنوں والی چھیڑی تھی کہ مہارانی کو غصہ آ گیا تھا۔

''خاندانی رنجش والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' بکری ذرا اور قریب کھسک آئی۔ ''ارے یہ بات بہت پرانی ہے''

گھوڑے نے افسردہ لہجے میں کہا اور چارہ چبانے لگا۔ بی بی بکری اس کے دوبارہ بولنے کے انتظار میں چپ چاپ، اس کے چلتے ہوئے منھ کی طرف دیکھتی رہی۔

چند برسوں پہلے کا قصہ ہے، ہرے بھرے جنگل میں یہ بھینس میری اکلوتی اور لاڈلی دوست تھی۔ ہم ہمیشہ ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔ گھاس چرتے وقت اور یونہی جنگل میں چہل قدمی کرتے وقت، کوئی اکیلا اور تنہا ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کے پیاس لگتی تو پانی پینے کے لیے بھی ایک ہی راستے سے ایک ہی جگہ جا کر پانی پیتے۔ وہ انسانوں میں ایک کہاوت ہے نا کہ "بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ کہ ہوتی ہے اس سے عداوت زیادہ" ایسا ہی ہوا، ہم دونوں کی محبت اچانک نفرت میں بدل گئی۔ ایک دن بھینس کو چڑانے کے لیے میں نے کہہ دیا کہ تیرا جسم بڑا بے ڈول ہے، تیرا رنگ کالا ہے اور تو دیکھنے میں بدصورت سی لگتی ہے اور تو عقل کی بھی موٹی ہے، میں تیرے مقابلے میں بہت خوبصورت ہوں، محنتی ہوں اور چالاک بھی۔ حالانکہ یہ ساری باتیں میں نے مذاق ہی مذاق میں کہی تھیں مگر ایسی موٹی بھدّی کو بہت بری لگیں۔ اس نے غصے میں آکر مجھے اپنے نوکیلے سینگ سے ایسا مارا کہ بس پوچھو مت! میں چوٹ کھا کر بھی ہنستا رہا اور وہ اپنے خطرناک سینگوں سے مجھے مار مار کر لہولہان کرتی رہی کہ جسم پر کئی گہرے زخم آگئے۔" گھوڑا بیتے دنوں کی درد بھری باتیں سنتے سناتے رو پڑا۔ تھوڑی دیر بعد، خود ہی سنبھل کر بولا۔ "میں تو نہتا تھا، اس کے پاس سینگ جیسا بھیانک ہتھیار تھا، اس لیے میں وہاں سے جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا، کیا کرتا اگر تھوڑی دیر وہاں اور رکتا تو وہ مجھے جان ہی سے مار دیتی، عجیب موٹی بھدّی عقل ہے اس کی کہ مذاق کو بھی سچ سمجھ کر خواہ مخواہ کی دشمنی کر بیٹھی۔" گھوڑا سانس لینے کے لیے تھوڑی دیر رُکا، پھر بولنے لگا: "غصے اور نفرت کی آگ سر پر چڑھ گئی تھی، میں اس آگ میں جلتا رہا اور سوچتا رہا کہ بھینس کو یہ لڑائی بالآخر مہنگی پڑے گی۔ میں نے سوچا اس سے بدلے کی بس ایک ہی صورت ہے کہ کسی انسان سے مدد لی جائے اور اسے بھی اتنی ہی مار پڑے کہ اس کے بدن کی ہڈیاں بھی دُکھنے لگیں۔"

یہ خیال آتے ہی، میں جنگل سے نکل کر، پاس کے گاؤں میں آگیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ انسان بڑا چالاک اور عیار ہوتا ہے، بغیر مطلب کے وہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔ میں بدلے کی آگ میں جل بھُن رہا تھا، اس لیے یہ باتیں، بھول گیا تھا۔ دور ایک کسان کندھے پر ہل ڈالے کھیت کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں اس کے قریب پہنچ کر، ہانپتے ہوئے بولا: "مجھے تمھاری مدد چاہیے، جنگل کی ایک بھینس نے سینگ مار مار کر مجھے اَدھ مرا کر دیا ہے، دیکھو میری پیٹھ کے زخم۔"

کسان نے سب کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد معصومیت سے کہا: "میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں، وہ بہت طاقتور ہے، اس کے پاس بڑے بڑے سینگ ہیں اور..."

میں تو دشمنی میں اندھا ہو رہا تھا، اس لیے بیچ ہی میں بول پڑا:

''میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ، ہاتھ میں موٹا سا مضبوط ڈنڈا لے لو، میں بھینس کے آگے پیچھے تمھیں لے کر جلدی جلدی گھوموں گا، تم ڈنڈے مار مار کر، اسے بے جان کر دینا۔ جب وہ بے دم ہو کر زمین پر گر پڑے تو رسّی سے باندھ لینا۔'' کسان پھر بولا: ''اس سے کیا فائدہ؟'' ''بھینس کا دودھ میٹھا، گاڑھا اور بہت لذیذ ہوتا ہے۔'' میں نے اسے فائدے بتائے۔

میری پیٹھ پر بیٹھ کر، ہاتھ میں بھاری، مضبوط اور لانبا سا ڈنڈا لے کر، کسان جنگل میں آیا، میری دشمن، کمینی بھینس بے فکری سے ہری ہری گھاس چرنے میں مصروف تھی کہ اچانک اس کے کالے کالے بدن پر ڈنڈے کی مار، لے دنا دن، لے دنا دن، پڑنے لگی۔ وہ گھبرا کر بھاگی تو میری پیٹھ پر بیٹھا کسان جلدی ہی اس کے قریب جا پہنچا، اور پھر وہی ڈنڈے کی جان لیوا چوٹ، بھینس رانی کو حسرت ہی رہ گئی کہ اپنے سینگ کا استعمال کرے۔ وہ جب بھی کوشش کرتی، ناکام ہو جاتی، آخر وہ بے دم ہو کر زمین پر گر پڑی۔ کسان نے میری پیٹھ پر سے اترنے کی زحمت نہیں کی بلکہ وہیں سے رسّی پھینک کر ایسے پھندے لگائے کہ بھینس کی گردن اور اس کی ٹانگیں بری طرح پھنس کر رہ گئیں اور وہ بے بس سی ہو کر گھنٹوں وہیں پڑی سڑتی رہی۔

میرے بدلے کی آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی اور اس بھاگم بھاگ میں بہت تھک بھی گیا تھا، اس لیے کسان سے ہانپتے ہوئے بولا: ''تمھارا بہت بہت شکریہ، تم میری مصیبت میں کام آئے، اب میں بھی تھک گیا ہوں اور زوروں کی بھوک بھی لگ رہی ہے، تم پیٹھ پر سے اتر جاؤ، تاکہ جنگل میں رہ کر کچھ کھا پی لوں اور آرام کروں۔''

انسان، بہرحال عقل میں ہم جانوروں سے بہت آگے ہے۔ میری بات سن کر، کسان زور زور سے ہنستے ہوئے بولا: ''ارے بیوقوف جانور! تجھے چھوڑ کیسے دوں، تجھ پر سواری کروں گا، بوجھ لادوں گا، اور بھینس سے اس کا دودھ حاصل کروں گا، تم دونوں ہی انسان کے کام آنے والے ہو۔''

گھوڑا بولتے بولتے چُپ ہو گیا۔ بکری بے تابی سے پوچھ بیٹھی: ''پھر کیا ہوا؟''

''بی بی بکری۔'' گھوڑا شرماتے ہوئے دوبارہ بولنے لگا: ''اس دن سے آج تک ہم دونوں کسان کے غلام ہیں، اس کا کھاتے ہیں اور اس کا کام کرتے ہیں۔ اب وہ جنگل کی آزادی کہاں، تھوڑی سی بھول کی اتنی بڑی سزا، شاید زندگی بھر جھیلنی ہوگی، آپس کی نااتفاقی نے یہ دن دکھایا۔ سچ ہے دو کی لڑائی میں، تیسرے کو فائدہ ہوتا ہے۔

□□□

Urdu Darbar
Rahmania School Street,
ASANSOL-713302 (W.B.)

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

...ح التذکرہ (جلد...

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال و کوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت -/140 روپے

...صاحت (دو جلد...

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

''بحر الفصاحت'' نظم و نثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت -/730 روپے

...یم چند کا تنقیدی مطا...

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے ان کی زندگی، ان کے تصور حیات، ان کے عہد اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب دسمبر 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت -/52 روپے

...سعادت حسن منٹو (...

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت -/285 روپے

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منضبط منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ''کلیات علی سردار جعفری'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر'' اور ''امن کا ستارہ'' اور دوسری جلد میں ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''پتھر کی دیوار''، ''ایک خواب اور''، ''پیراہن شرر''، ''لہو پکارتا ہے'' اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اوّل صفحات: 496، قیمت -/164 روپے، جلد دوم: صفحات: 533، قیمت -/200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش رووں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ ''کلیات حسن نعیم'' میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت -/185 روپے

...وشش (منظر نا...

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ فلم ''کوشش'' کا یہ منظر نامہ جاپانی فلم ''ہیپی نیس آف اس الون'' پر مبنی ہے، جس میں ایک گونگے بہرے لڑکے اور ایک گونگی بہری لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 84، قیمت -/48 روپے

...رے اپنے (منظر...

مصنف: گلزار

قومی اردو کونسل نے فلمی منظر ناموں کی اشاعت خاص طور سے ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی کے لیے شروع کی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ منظر نامہ ''میرے اپنے''، مشہور فلم ساز تپن سنہا کی بنگالی فلم ''اپن جن'' کی کہانی پر مبنی ہے۔

صفحات: 139، قیمت -/63 روپے

Date of Publication : 24/08/2009
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, September 2009, Vol. 11, Issue: 9
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا پاٹل فلم "سلم ڈاگ ملینیر" کی موسیقی اور گیتوں کے لیے
آسکر ایوارڈ یافتہ موسیقار اے. آر. رحمٰن اور نغمہ نگار گلزار کو راشٹرپتی بھون میں اعزاز عطا کرتے ہوئے

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-[illegible] and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020
[illegible] Editor: Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel: 26103381, 26103938